Oriental College Magazine, Vol.102, No. 01, Serial No. 383, 2026

سیّد سَید علی ثانی گیلانی کی سوانحی و تاریخی کتب کا جائزہ

محمد ریاض القادری
لیکچرار اردو، ڈی پی ایس کالج، تاندلیانوالہ، فیصل آباد

A Critical Review of the Biographical and Historical Works of Sayad Said Ali Saani Gilani

Muhammad Riaz ul Qadri
Lecturer in Urdu
DPS College Tandlianwala, Faisalabad

Abstract

Sayyed Said Ali Saani Gilani is a distinguished contemporary scholar whose research has significantly contributed to the study of the Qadriya Sufi Order, the biographies of Sufi saints, and the preservation of spiritual lineages in the Indian subcontinent. As the Chief Administrator of Idara Sawt-e-Haadi and a scholarly heir of the Khanwada of Data Shah Chiragh, he possesses unique access to family traditions and historical records, which strengthens the authenticity of his research. His writings are marked by objectivity, critical analysis, and strict adherence to scholarly methodology. Through his major works including Seerat-o-Sawaaneh Hazrat Sayyed Abdul Razzaq Gilani Maroof Data Shah Chiragh Lahori, Anees al-Mazaahir fi Seerat as-Sayyed Abdul Qaadir Jilani, and Hasb-e-Maraatib he has systematically documented the history, spiritual teachings, and intellectual heritage of the Qadriya Order. By critically examining earlier sources and distinguishing authentic traditions from unreliable accounts, Gilani has filled a significant research gap in the historiography of the Qadriya lineage after the works of Shaykh Abdul Haqq Muhaddith Dehlavi. His writings not only present historical narratives but also serve as reformative guides that encourage the followers of the Order to uphold the ethical and spiritual ideals of their predecessors. Consequently, his works hold an important place in contemporary Islamic and Sufi scholarship.

Keywords:
Qadriya Sufi Order, Sayyed Said Ali Saani Gilani, Sufi Biography, Sawt-e-Haadi, Data Shah Chiragh Lahori, Islamic Scholarship, Sufi Historiography.

سید سَید علی ثانی گیلانی معاصر دور کی اُن درخشاں علمی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے برصغیر میں سلسلۂ قادریہ کی تاریخ، اولیائے کرام کی سوانح، خاندانی نسب نامے اور روحانی روایات کی تحقیق کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ وہ "ادارہ صوت ہادی" کے منتظم اعلیٰ اور خانوادۂ داتا شاہ چراغؒ کے علمی و روحانی وارث ہیں ۔ اس نسبت نے ان کی علمی کاوشوں کو داخلی بصیرت عطا کی ہے اور انھیں خاندانی روایات تک براہِ راست رسائی کا وہ درجہ نصیب ہوا جو بیرونی محققین کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ مگر ان کا امتیاز صرف نسلی نسبت نہیں، حقیقی امتیاز اُن کی تحقیق، تنقید، تجزیے اور تاریخی مواد کی چھان پھٹک میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ہمیشہ معروضی طرز کو مقدم رکھا اور ہر روایت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کیا۔ یہی وصف انھیں صوفیانہ تذکرہ نگاروں، روایتی مصنفین اور عام مؤرخین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں خاندانی رشتہ ضرور جھلکتا ہے، مگر وہ کسی مقام پر علمی دیانت اور تحقیق کے منہج سے انحراف نہیں کرتے۔ اسی لیے ان کی کتب کو محققین نے مرجع، مستند اور محققانہ تدوین کے طور پر قبول کیا ہے۔ ان کے قلم میں ادبی نرمی بھی ہے اور تنقیدی سختی بھی؛ روایت کا احترام بھی اور حقیقت کی تلاش بھی۔ سید سَید علی ثانی جیلانی کی علمی، ادبی اور خانقاہی خدمات برصغیر کے فکری ورثے کا اہم باب ہیں۔ وہ موثر منتظم، بصیرت افروز معلم، صاحبِ طرز نثر نگار اور اصلاحِ باطن کے علم بردار ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے جو ایک طرف روایت کے تسلسل کو مضبوط کرتی ہے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے فکری تقاضوں کا ادراک بھی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ادارہ صوتِ ہادی" کی تنظیمِ نو ہو یا علمی و تربیتی نشستوں کا اہتمام، دروس و خطبات کا سلسلہ ہو یا مخطوطات کی حفاظت و اشاعت ہر میدان میں ان کی محنت، حکمت اور بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے خانقاہی نظام کو محض رسوم تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اسے علم، تحقیق، اخلاق اور خدمتِ خلق کے ایسے ہم آہنگ مرکز میں تبدیل کیا جو اپنی روحانی حرارت اور علمی سنجیدگی دونوں کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ ان کے خطبات میں فکری نظم، تاریخی شعور، صوفیانہ آہنگ اور اصلاحی پیغام ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں، جبکہ تحریروں میں سادگی، شستگی اور تحقیق پر مبنی طرزِ بیان سامنے آتا ہے۔ ان اوصاف نے ان کو اس عہد کے معتبر صوفی، موثر مفکر اور صاحبِ طرز محقق کا درجہ عطا کیا ہے۔ یہ تحقیقی مضمون اسی پس منظر میں سید سَید علی ثانی جیلانی کی سوانحی و تاریخی خدمات اور فکری جہات کا جامع مطالعہ پیش کرتا ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کتابیں محض مصنف کہلانے کی غرض سے نہیں لکھتے بلکہ ہر وہ موضوع جس پر علمی کمی یا تحقیق کا خلا محسوس ہو، اسی کو اپنی کاوش کا مرکز بناتے ہیں۔ انھی اصولوں کے تحت ان کی تحریریں ظاہری جلوہ آرائی سے بے نیاز، تحقیقی گہرائی اور فکری دیانت پر قائم دکھائی دیتی ہیں۔ برصغیر کی صوفیانہ تاریخ میں اہلِ چشت کی خدمات کا ایک طویل اور روشن سلسلہ موجود ہے۔ ان کے ہاں تصوف، سوانح اور تذکرہ نگاری کا ذخیرہ وافر اور متنوع ہے۔ اس کے برعکس سلسلۂ قادریہ، جو دائرۂ تصوف میں

سب سے وسیع تر اور اثر انگیز سلسلہ شمار ہوتا ہے، اپنے علمی و تحقیقی ذخیرے کے اعتبار سے ایک خلار کھتا ہے۔ اس وسیع سلسلے میں عبد الحق محدث دہلویؒ کے بعد کوئی ایسی جامع علمی روایت دکھائی نہیں دیتی جو سلسلہ قادریہ کی تاریخ، تعلیمات اور روحانی تسلسل کو منظم صورت میں پیش کرتی ہو۔ یہی وہ کمی ہے جسے سید سید علی ثانی نے باریک بیں تحقیق، تاریخی مطالعے اور منظم تدوین کے ذریعے پورا کیا ہے۔ انھوں نے صرف اَسناد کی فہرستیں جمع نہیں کیں بلکہ پوری تاریخ قادریت کو ایک مربوط سلسلے کی طرح مرتب کیا ہے، جس میں سوانح، افکار، مشاہدات اور عملی نقشِ قدم سب کچھ باکمال احتیاط سے جمع کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے کئی وارثانِ سلسلۂ قادریہ کے طرزِ عمل سے بے اطمینانی رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف محض سلسلے کی نسبت یا خاندانی وراثت کا نام نہیں، بلکہ عمل، اخلاق، خدمت اور باطن کی تہذیب سے عبارت ہے۔ اسی لیے ان کی کتابیں محض تاریخ نہیں بلکہ ایک طرح کی اصلاحی دستاویزات بھی ہیں، ایسی تحریریں جو صاحبزادگان اور وارثانِ سلسلہ کو ان کے اسلاف کے کردار کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ ان کی سوانحی اور تاریخی کتب کا تجزیہ پیش خدمت ہے۔

سیرت و سوانح حضرت سید عبدالرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوریؒ: (موسومہ بہ تاریخ قادریت، تاریخ، تجزیہ، تنقید، تحقیق)

سوانحی ادب میں محققین کو ہمیشہ یہ چیلنج درپیش رہتا ہے کہ وہ تاریخی مواد کے انبار میں سے صحیح اور معتبر روایتوں کو چھانٹ کر پیش کریں۔ زیرِ مطالعہ کتاب کے مصنف سید سَید علی ثانی جیلانی نے بھی جب حضرت سید عبدالرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوری کی حیات وخدمات کو قلم بند کرنے کا بیڑا اٹھایا تو سب سے پہلے انہیں منقولات روایات اور خاندانی سینہ بہ سینہ روایتوں کے سیلاب کا سامنا ہوا۔ تاریخی ماخذات کے تضادات، ادھوری خبریں، اور مختلف مصنفین کی ناقص یا مبہم معلومات نے ان کے لیے قوتِ فیصلہ کو ایک کڑا امتحان بنا دیا کہ کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑ دیا جائے۔ دوسری طرف خاندانی روایات کا ایک الگ پلندہ موجود تھا، جس نے ان کے لیے تحقیق کو بیک وقت سہل بھی بنایا اور مشکل بھی تاہم مصنف نے ان تمام روایات کو چھان پھٹک کے بعد نہ صرف کتاب میں درج کیا بلکہ ان پر اپنی رائے بھی پیش کی، تضادات کو واضح کیا اور صحیح کو غلط سے الگ کر کے ایک متوازن اور مستند تصویر قاری کے سامنے رکھ دی۔ یہ کتاب "ادارہ صوت ہادی شیخوشریف" نے ۲۰۱۴ء میں شائع کی۔ یہ کتاب محض ایک سوانح عمری نہیں بلکہ تاریخ قادریت کی پہلی جامع و محققانہ تصنیف ہے جس میں پورے سلسلہ قادریہ کی تاریخ، ارتقائی مراحل اور فکری بنیادوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ مصنف نے سلسلہ قادریہ کے مشائخ، ان کے احوال و معمولات، حضرت داتا شاہ

چراغؒ کے آبا و اجداد، ان کے نسب اور طریقت، ان کے مشائخ اور خلفاء کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ابواب بندی سے کتاب کی تحقیقی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ کتاب اپنے اندر سیرت، تاریخ اور تذکرہ نگاری تینوں کی جامعیت سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلے باب میں سلسلہ قادریہ اور مشائخ قادریہ کے احوال کا جامع انداز میں جائزہ لیا گیا ہے اور سید عبدالرزاق گیلانی کا سلسلہ تصوف مکمل بیان کیا گیا ہے۔ یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔دوسرے باب میں حضرت داتا شاہ چراغؒ کے آبا و اجداد کے حالات اور ان کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اس باب میں ہمیں تاریخ ہندوستان کے کئی اہم مباحث ملتے ہیں خصوصاً اچ، لاہور اور سنگھرہ کی تاریخی حیثیت اور اہمیت کا علم ہوتا ہے۔یہ باب بھی دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب کتاب کا مرکزی حصہ ہے اس کی پانچ فصلیں ہیں جو حضرت داتا شاہ چراغؒ کی سوانح عمری پر مشتمل ہیں ۔فصل اول میں تمہید اور اس دور کا تاریخی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔فصل دوم میں متقدمین مصنفین اور ان کے تذکروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو شاہ چراغ لاہوری کے احوال سے متعلق بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔فصل سوم شاہ چراغ لاہوری کے نام و نسب،احوال اقوال اور متعلقات پر مشتمل ہے۔چوتھی فصل میں ان کے شیخ و مرشد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پانچویں فصل میں بقیہ متعلقات و معمولات مثلاً محلہ رسول پورہ کی اصل حقیقت، سیر و سیاحت، شاہ جہاں کی عقیدت مندی، اس دور کی اہم شخصیات، تبلیغی خدمات، مختلف قوموں کا آپ کے ہاتھ پہ قبول اسلام اور وفات حسرت آیات کا بیان ملتا ہے۔چوتھا باب حضرت کی ازواج اور اولاد کے احوال پر مشتمل ہے جبکہ پانچویں باب میں ان کے خلفا کا ذکر کیا گیا ہے جو بلاواسطہ اور بالواسطہ حضرت سے مستفید ہوئے اور جن سے بعد میں نئے سلاسل نے جنم لیا۔اس باب کی تین فصلیں ہیں۔ان ابواب کی ترتیب اور مواد کتاب کو ایک مکمل اور مربوط شکل دیتے ہیں جس میں نہ کوئی پہلو تشنہ رہتا ہے اور نہ کسی اہم جزو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں حضرت شاہ چراغؒ کے آبائے کرام کا نہایت مفصل تذکرہ ملتا ہے۔ مصنف نے نہ صرف آپ کی اولاد اور ان سے وابستہ خاندانوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ سلسلۂ نسب اور شجرۂ طریقت کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ مشائخ اور آبائے کرام کے ابواب میں متعدد شخصیات مشترک نظر آتی ہیں، تاہم ہر موقع پر ان کے ذکرِ خیر کو ایک نئے زاویے اور الگ اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے تکرار کے بجائے تنوع اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ مزید برآں، اس کتاب میں "حیات الامیر" کا خلاصہ بھی درج کیا گیا ہے۔مصنف نے محض روایت نگاری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علمی نقد و جرح کے اصولوں کو سامنے رکھ کر مآخذ کو پرکھا اور ان میں موجود کمزوریوں کی نشان دہی کی۔انھوں نے قدیم تذکروں جیسے مخطوطہ "عین

تصوف" ازسید مجتبیٰ گیلانی لاہوری" خزینۃ الاصفیاء" از مفتی غلام سرور لاہوری،" بزرگانِ لاہور" از پیر غلام دستگیر نامی،" خطہ پاک اوچ" از مسعود حسن شہاب، "اولیاء لاہور" از محمد لطیف ملک، ایم اے، "لاہور میں اسلام کے سفیر (عہد غزنوی سے قیام پاکستان تک)" ازڈاکٹر خواجہ عابد نظامی اور" تاریخ لاہور" از کنھیالال اور دیگر مآخذ کے تقابلی مطالعہ کے بعد تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان تمام تذکروں کو سامنے رکھ کر ان میں موجود ابہام، کمزوریوں، تضادات اور ادھورے بیانات کی نشاندہی کی ہے۔ کئی مصنفین نے نسب کے حوالے سے مکمل معلومات فراہم نہیں کیں، بعض نے اولاد کا ذکر ادھورا چھوڑ دیا اور بعض احوال کو بغیر تحقیق کے نقل کیا۔ سید علی ثانی جیلانی نے ان تمام بیانات کو پرکھ کر صحیح اور معتبر روایات کو الگ کیا اور اپنی رائے بیان کی۔ بعض ایسے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جو پہلے احاطہ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ یہی تنقیدی رویہ اس کتاب کو روایتی تذکرہ نگاری سے ممتاز کرتا ہے اور اسے معیاری تحقیق کا درجہ دیتا ہے۔ مصنف کے تجزیے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> "محمد لطیف ملک صاحب کو اگرچہ "تاریخ لاہور" لکھنے کے ساتھ ساتھ " اولیائے لاہور" قلمبند کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے، اور اس تحریر سے یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کی تکمیل کی خاطر کئی کتابوں کی ورق گردانی بھی کی مگر اس مضمون میں ان کی معلومات انتہائی غیر معتبر اور صداقت کے معیار سے گری ہوئی ہیں۔ قارئین خط کشیدہ الفاظ پہ غور فرمائیں۔۔۔۔ مزارات کے متعلق معلومات غلط ہیں۔ ناموں کا فرق بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ نہ تو داتا شاہ چراغ کے کسی بیٹے کا نام زین العابدین ہے اور نہ ہی سید عبدالقادر ثانی کی مزار یہاں ہے۔ حضرت کے سات بیٹوں کے نام بالترتیب نور محمد سید مصطفی سید محمود سید اسماعیل سید شمس الدین سید عبداللہ اور سید نصراللہ ہیں زین العابدین اپ کے بڑے بھائی اور مرشد بھی ہیں اور یہاں مزار سید عبدالقادر ثانی کی بجائے اپ کے دادا سید عبدالقادر ثالث کی ہے اور دوسری بات سید عبدالوہاب حضرت سید محمد غوث بالا پیر کے بیٹے نہیں بلکہ پوتے ہیں اور سید عبدالقادر ثالث کے بیٹے ہیں تیسری بات ستھرا میں مزار صرف اور صرف حضرت بالا پیر کا ہے باقی تمام اولاد کے مزارات لاہور ہی میں ہیں۔ "(۱)

مفتی غلام سرور لاہوری کی گراں قدر تصنیف "خزینۃ الاصفیاء" کے تجزیے میں مصنف نے علمی دیانت داری اور فراخ دلی کے ساتھ اس کے جملہ محاسن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس کتاب کی افادیت اور کی علمی لگن مصنف کا اعتراف کیا بلکہ اس کے علمی و تحقیقی اسلوب کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے تاہم، جہاں کہیں کمی بیشی یا سہو کا شائبہ ہوا ہے، وہاں اسے صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ قاری کے سامنے اصل ماخذ کی حقیقت عیاں ہو جائے۔ لکھتے ہیں:

> "خط کشیدہ الفاظ کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ یہاں ناموں کا تسامح ہو گیا ہے یہاں چار نام چھوڑ دیے گئے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے فارسی کے اصل نسخہ کی طرف رجوع کیا وہاں الحمدللہ نام صحیح اور درست ہیں مگر وہاں بھی سید محمد غوث بالا پیر زین العابدین لکھا ہوا ہے یعنی درمیان میں بن کا لفظ وہاں بھی چھوٹ گیا تاہم ہم اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ یہ غلطی کتابت کی ہے نہ کہ مصنف کی بہرحال حضرت کا صحیح نسب اس طرح ہے سید عبدالرزاق بن سید عبدالوہاب بن سید عبدالقادر ثالث بن سید محمد غوث بالا پیر بن سید زین العابدین بن سید عبدالقادر ثالث بن سید محمد غوث اول مخدوم اول اچ مبارکہ۔"(۲)

مصنف نے اپنے ہر دعوے کو اس قدر مضبوط دلائل کے ساتھ زیب قرطاس کیا ہے کہ تردید کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ گویا ان کی تحریر حجتِ بالغہ اور برہانِ قاطعہ کا آئینہ دار ہے۔اس استحکام کی دو بنیادیں ہیں: اول یہ کہ انھوں نے اپنی عمرِ گراں مایہ کا وافر حصہ اس موضوع کی تحقیق میں صرف کیا، اور دوم یہ کہ "صاحب البیت ادریٰ بما فیھا" اس لیے وہ جس وثوق اور بصیرت سے اظہار کرتے ہیں، وہ غیر اہل کے بس کی بات نہیں۔ان کے پاس محض روایات کا سہارا نہیں بلکہ معتبر تذکرے، مزارات و اسماکے مستند حوالہ جات، خاندانی انساب کی روشن کڑیاں اور نایاب مخطوطات کے زندہ شواہد موجود ہیں۔یہی وہ سرمایہ ہے جو ان کی تنقید کو جرأت و بےباکی عطا کرتا ہے اور ان کے استدلال کو"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"کے درجہ پر فائز کرتا ہے۔یوں ان کی تحریر میں وہی عنصر جلوہ گر ہے جو تحقیق کا وقار اور سچائی کا جلال ہوتا ہے۔کتاب کا اسلوب اور زبان بیان نہایت متوازن، مربوط، محققانہ اور معروضی ہے۔ مصنف اگرچہ خانوادۂ داتا شاہ چراغؒ سے تعلق رکھتے ہیں اور عقیدت ان کے لہجے میں جھلکتی ہے لیکن علمی دیانت سے کہیں انحراف نہیں کیا۔خاندانی روایات کو مصنف نے سینہ بہ سینہ حاصل کر کے انہیں تاریخی مآخذ کے ساتھ ملا کر پرکھا ہے اور پھر نتیجہ پیش کیا ہے۔زبان میں ادبی لطافت اور فصاحت کا رنگ غالب ہے، جو قاری کو محض ایک خشک تحقیقی متن نہیں بلکہ ایک زندہ تاریخ پڑھنے سا لطف دیتا ہے۔یہ تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے قبل حضرت داتا شاہ چراغؒ کی حیات و خدمات پر کوئی جامع کتاب موجود نہیں تھی۔ متقدمین کے تذکروں میں ان کا ذکر تو ضرور ملتا تھا لیکن وہ بکھرا ہوا اور غیر مربوط تھا۔مصنف نے پہلی بار ان تمام مواد کو جمع کر کے ایک مربوط اور مستند تصویر قاری کے سامنے رکھی۔ مجموعی طور پر "سیرت و سوانح حضرت سید عبدالرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوری" نہ صرف ایک شخصیت کی سوانح ہے بلکہ تاریخ قادریت کی پہلی جامع تدوین ہے۔اس کتاب نے جہاں خاندانی روایات کو دستاویزی شکل دی، وہاں قدیم تذکروں میں پھیلے تسامحات کو دور کر کے درست تصویر سامنے رکھی۔

انیس المظاہر فی سیرت السید عبدالقادر جیلانی:

"ادارۂ صوتِ ہادی" کی ادبی و دینی خدمات کا ایک نہایت درخشاں پہلو یہ ہے کہ اس نے متعدد علمی و تحقیقی متون کو جدید طرز پر مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کیاہے۔انھی علمی کاوشوں میں ایک گراں قدر اضافہ "انیس المظاہر فی سیرت السید عبدالقادر جیلانی" ہے، جسے پہلی بار ۲۰۱۱ء میں منصۂ شہود پر لایا گیا۔بعد ازاں وقت کی ضرورت اور قارئین کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۲ء میں شائع کیا گیا۔یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ایک علمی اور تحقیقی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ قارئین کے دلوں میں اس کی معنویت اور اہمیت بدستور تازہ ہے۔حکیم غلام حیدر سہیل کی تصنیف "سیرت شیخ عبدالقادر جیلانی "اگرچہ بظاہر صرف چھانوے صفحات پر مشتمل ایک مختصر تصنیف ہے اور اس کی ماہیت ایک رسالے کی سی ہے، تاہم اس کے مندرجات میں وسعتِ معانی اور عمقِ فکر اس قدر ہے کہ یہ ضخیم کتابوں کے برابر حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔اس کی ترتیب و تدوین میں روایتی ابواب بندی کے بجائے چودہ عناوین میں منقسم ہے۔ہر عنوان اپنے اندر ایک مختصر اور جامع باب کی حیثیت رکھتا ہے اور ان سب کی مجموعی ساخت حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک ہمہ جہت خاکہ مرتب کرتی ہے۔پہلا عنوان "عزمِ سفر" کے نام سے ہے، جس میں مصنف نے حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے وطن جیلان سے بغداد کی طرف رختِ سفر باندھنے کے واقعات کو بیان کیا ہے۔یہ عنوان محض ظاہری سفر کی روداد نہیں بلکہ باطنی اور روحانی ارتحال کی ایک تمہید ہے جو آئندہ تمام مباحث کا مقدمہ فراہم کرتی ہے۔دوسرا عنوان "دیارِ غربت "ہے۔یہاں مصنف نے بغداد میں انہیں درپیش مشکلات و مصائب اور اس نئے ماحول میں ڈھلنے کے لیے درکار صبر و استقامت کا نقشہ کھینچا ہے۔یہ دراصل اس مجاہدانہ حیات کی عکاسی کرتا ہے جو ہر سالکِ راہِ حق کو درپیش ہوتی ہے۔تیسرا عنوان "بیرونِ در"ہے۔اس حصے میں اُس زمانے کی علمی فضا، فقہی مباحث اور مختلف فرقہ وارانہ فتنوں کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔بالخصوص فقہ حنبلی کی شہرت و غلبہ اور اس سے وابستہ علمی سرگرمیوں کا ذکر اس عنوان کا خاص حصہ ہے۔اسی ضمن میں بعض معتبر کتب کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جو علمی ماحول کی گہرائی کو واضح کرتے ہیں۔چوتھا عنوان "درگاہِ پیرِ مغاں "ہے، جس میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی تلاشِ حق اور روحانی کیفیات کو بڑے دلنشیں انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔اسی حصے میں ان کے تصوف کی طرف میلان اور شیخ حماد کی صحبت و فیض کا ذکر ملتا ہے جو ان کی روحانی تربیت کے نہایت اہم مراحل میں شمار ہوتا ہے۔پانچواں عنوان "جادۂ دوست"ہے۔اس میں عشقِ حقیقی کی لذت، سلوک کی منازل اور حضرت جیلانیؒ کے مسلسل روحانی

ارتقا کا بیان ملتا ہے۔اس حصے میں عشقِ الٰہی کے جذب و کیف کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود کو سالک کی کیفیات میں شریک محسوس کرتا ہے۔چھٹا عنوان "مینار ہائے نور" ہے۔ یہاں مصنف نے مختلف مشائخِ تصوف اور ان کی علمی و روحانی حیثیت کو بیان کیا ہے، گویا یہ حصۂ ایک مختصر تذکرۂ مشائخ بھی ہے جو حضرت جیلانیؒ کی فکری و روحانی تربیت کے تناظر میں نہایت معنی خیز ہے۔ساتواں عنوان "فیضِ روح القدس "ہے۔اس حصے میں ان کی علمی شہرت، وعظ و نصیحت کی مجالس اور عوام و خواص پر گہرے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔یہ وہ مرحلہ ہے جب حضرت جیلانیؒ کی شخصیت علمی و روحانی دونوں حوالوں سے بغداد کے افق پر درخشاں ہو کر سامنے آتی ہے۔آٹھواں عنوان "شب و روز "کے نام سے ہے۔یہاں روز و شب کے معمولات، عبادات، ذکر و اذکار اور عملی زندگی کے وہ پہلو اجاگر کیے گئے ہیں جو ایک صوفیِ کامل کی حیات کا عملی نقشہ پیش کرتے ہیں۔نواں عنوان" احیائے دین "ہے۔اس حصے میں حضرت جیلانیؒ کی اصلاحی و تجدیدی کاوشوں کو بیان کیا گیا ہے۔انھوں نے اپنے دور کے مختلف فتنوں کے سدِّ باب اور احیائے دین کی جدوجہد کے ذریعے امت کو ایک نیا ولولہ عطا کیا۔یہ حصہ دراصل ان کے مجددانہ کارناموں کی روداد ہے۔دسواں عنوان "حاصلِ دین"کے زیرِ عنوان ہے۔ اس میں سب سے نمایاں کارنامہ یعنی نسبتِ قادریہ کی اشاعت اور سلوکِ قادریہ کی تدوین کا ذکر ملتا ہے۔یوں اس حصے کو حضرت جیلانیؒ کی علمی وروحانی خدمات کا خلاصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔گیارہواں عنوان "مقامِ غوثیت " ہے، جس میں ان کے روحانی مرتبے اور مقامِ ولایتِ کبریٰ کو موضوع بنایا گیا ہے۔یہ وہ حصہ ہے جو حضرت جیلانیؒ کی عظمتِ روحانی اور ان کے فیضانِ باطنی کی گہرائیوں کو نمایاں کرتا ہے۔بارہواں عنوان "کوہِ عظمت "ہے۔اس میں حضرت جیلانیؒ کے علمی مقام، فقہی مہارت اور درس و تدریس کے امتیاز کو بیان کیا گیا ہے۔یہاں مصنف نے ان کی شخصیت کو علم وعرفان کے ایک پہاڑ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔تیرہواں عنوان "کرامات"ہے، جس میں نہ صرف حضرت جیلانیؒ کی کرامات کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ ان کی شرعی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ حصہ اعتدال اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے تاکہ کرامت کے تذکرے کو محض عوامی عقیدت کی سطح پر محدود نہ رکھا جائے۔چودہواں اور آخری عنوان "وداع و وصال "ہے، جس میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے وصالِ مبارک کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ حصہ نہایت رقّت انگیز ہے اور قاری کو اس عظیم روحانی رہنما کی زندگی کے آخری لمحات کی کیفیات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔یوں یہ چودہ عنوانات مجموعی طور پر حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو کو سمیٹ لیتے ہیں۔ہر عنوان میں نہ صرف تاریخی و سوانحی پہلو نمایاں ہیں بلکہ تصوف، سلوک اور احیائے دین کے ان

گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو ان کی شخصیت کو جامعیت عطا کرتے ہیں۔کتاب کا حجم گو مختصر ہے تاہم معنوی طور پر یہ ایک عظیم الشان تحقیقی و ادبی مرقع کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ کتاب ایک ایسی گراں قدر کتاب ہے جو اپنی ندرتِ اسلوب اور تحقیق کی گہرائی کے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے۔اس کا مطالعہ قاری کو صرف ایک روحانی سوانح تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ایک تحقیقی کائنات میں لے جاتا ہے جہاں تاریخ، تصوف اور ادب ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔مصنف حکیم غلام حیدر سہیل نے محض چھیانوے صفحات پر سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی حیاتِ مبارکہ کے ایسے گوشے منکشف کیے ہیں جو عام طور پر ضخیم تذکرہ نگاری میں بھی نظر نہیں آتے۔کتاب کے مدوّن سید علی جیلانی مقدمے میں مصنف کے اسلوب کے بارے لکھتے ہیں:

"موصوف حکیم غلام حیدر سہیل صاحب (مصنف)کا اسلوب بیان اتنا اچھوتا اور دل نشین ہے کہ ہر ہر حرف دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور واقعات اگرچہ افسانوی انداز میں لکھے گئے مگر نہایت مستند ہیں جو مدعا کوئی صفحات در صفحات لکھ کر بھی نہیں کہہ پاتا وہ بڑی سادگی سے صرف چند لفظوں میں کہہ جاتے ہیں۔"(۳)

ان کی تحریر میں جو حسنِ ایجاز پایا جاتا ہے وہ "ایجاز مع الاعجاز"کی بہترین مثال ہے۔وہ موضوع کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ نہ طوالت کا بوجھ محسوس ہوتا ہے اور نہ اختصار سے معنی پر پردہ پڑتا ہے۔یہ وہی فن ہے جو کسی بڑے محقق اور صاحبِ اسلوب ادیب کو میسر ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب نے تاریخ اور تصوف کے گنجینۂ معانی کو مختصر دامن میں سمیٹ کر ایک ایسا آئینہ فراہم کیا ہے جس میں قاری بغداد کی گلیوں، خانقاہِ غوثیہ کے حجرات اور مدرسۂ نظامیہ کی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔منظر نگاری اپنی دل آویزی اور طرزِ بیان کے باعث ایسی دلکش و یگانہ ہے کہ گویا الفاظ خود مصوّر ہو کر قاری کی آنکھوں کے سامنے نقش و نگار ابھارتے ہیں۔منظر نگاری کا انداز ملاحظہ ہو:

"بغداد بغداد تھا۔بلند و بالا عمارتوں اور جگمگاتی روشنیوں کا شہر جس کے درمیان دجلہ رواں تھا۔جہاں دن بھر مثلث نما باد بانوں والی لمبی لمبی کشتیاں سامان تجارت لانے اور لے جانے میں مصروف رہتیں اور شام کے وقت رؤسا کے آراستہ و پیراستہ بجرے سطح آب پر رواں دکھائی دیتے جن میں تربیت یافتہ کنیزیں چنگ و دف کی صداؤں پر نغمہ سرا اور رقص کناں ہوتیں اور ارباب عیش نبیذ کے جام لنڈھائے مست وبے خود ہوتے، دریا کے شمالی کنارے پر کسر خلافت تھا، جس کے پس منظر میں قصر الذہب، قصر الخلد، قبتہ الخضراء اور جامعہ مسجد کے گنبد و مینار عظمت و سطوت خوش

ذوقی اور حسن تعمیر کے آئینہ دار تھے۔ جنوبی کنارے پر امراء کے محل تھے جن کی سنگی محرابوں اور مرمریں دیواروں کے سایہ میں حسین و جمیل کنیزوں کے جھنڈ اس طرح پھرتے جیسے جنگل میں ہرنیوں کے غول ہوں ،بغداد کے چھت دار بازاروں میں مال و تجارت کے ڈھیر لگے رہتے اور لمبی لمبی عباؤں والے تاجر درہم و دینار کی تھیلیاں کمر سے باندھے ان کی خرید و فروخت میں لگے رہتے۔"(۴)

مصنف کا اسلوب بیان اپنی دل آویزی اور شیریں بیانی کے باعث قاری کو ابتدا سے انتہا تک مسحور کیے رکھتا ہے۔وہ واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ محض خبر یا روایت نہ لگے بلکہ ایک جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے ابھر آئے۔کہیں بغداد کی علمی مجالس کا وقار ہے، کہیں مریدین کے حلقے میں وارفتگی و سرشاری ہے، کہیں صاحب دل فقرا کی محفلیں ہیں، اور کہیں سلوک و معرفت کے دقیق مراحل کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کا حسن ہے۔ تاریخ کے کئی کٹھن موڑ اور تصوف کے پیچیدہ مراحل مصنف نے نہایت مہارت سے بیان کیے ہیں۔یہ اسلوب صرف ایک مؤرخ کا نہیں بلکہ ایک فنکار ادیب اور وجدان رکھنے والے محقق کا اسلوب ہے۔اس کتاب میں تصوف اور سلوک کے وہ پہلو بھی نہایت سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں جنہیں عام طور پر محققین مشکل الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔حکیم غلام حیدر سہیل نے ان دقیق مباحث کو سادہ مگر پراثر زبان میں بیان کیا ہے۔وہ قاری کو مشکل اصطلاحات میں الجھاتے نہیں بلکہ آسان پیرایہ اختیار کر کے اصل مقصد کو دل میں اتار دیتے ہیں۔یہی وہ خوبی ہے جو اس کتاب کو نہ صرف محققین کے لیے مفید بناتی ہے بلکہ عام قارئین کے لیے بھی پُرکشش اور دلنشیں بناتی ہے۔اب نگاہِ مطالعہ کو اس کتاب کے دوسرے شاہکار، یعنی اس کے تعلیقات و حواشی کی طرف موڑتے ہیں تاکہ مدوّن کے علمی و ادبی محاسن پر روشنی ڈالی جا سکے۔اس تصنیف کو مزید معتبر اور وقیع بنانے میں سید سید علی ثانی جیلانی کے لکھے ہوئے حواشی اور تعلیقات کا بنیادی کردار ہے۔انھوں نے اصل متن کو اس انداز میں سہارا دیا ہے کہ کتاب تحقیق و تنقید کی ایک مکمل اور جامع دستاویز بن گئی ہے۔ان کے حواشی محض توضیح یا حوالہ نہیں بلکہ علمی تحقیق اور مآخذ شناسی کا ایک ایسا سرمایہ ہیں جو کتاب کو نئی جہت عطا کرتے ہیں۔یہ حواشی اس قدر عرق ریزی اور باریک بینی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ قاری کو نہ صرف اصل متن کی تفہیم میں سہولت ملتی ہے بلکہ جدید تحقیق کا ذوق بھی پورا ہوتا ہے۔یہ کتاب اپنے طرزِ تدوین میں ایک منفرد اسلوب کی حامل ہے کہ مصنف نے عمومی روایت کے برعکس حواشی کو ہر صفحے پر درج کرنے کے بجائے کتاب کے آخر میں یکجا کر دیا ہے۔اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ قاری پہلے متن کو یکسوئی کے ساتھ پڑھے، اس کے ادبی ذوق کی تسکین ہو اور مطالعہ کا تسلسل بھی برقرار رہے۔بعد ازاں

جب وہ تعلیقات و حواشی کی طرف رجوع کرے تو نہ صرف اصل واقعات کی استنادی حیثیت سے واقف ہو بلکہ معتبر حوالوں کے ذریعے تحقیق کی ایک نئی جہت کا بھی مشاہدہ کر سکے۔اگر کوئی قاری مطالعے کے دوران ساتھ ساتھ واقعات کی استنادی حیثیت سے بھی آگاہ ہونا چاہے تو مصنف نے اس کی سہولت کے لیے ہر عنوان کے اختتام پر متعلقہ حواشی کا صفحہ نمبر درج کر دیا ہے۔یوں اصل متن کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور قاری کو تحقیق کے عمل میں براہِ راست رہنمائی بھی میسر آتی ہے۔یہ اسلوب دراصل روایت سے ہٹ کر ایک ایسا منفرد اور جدت آمیز طریقہ ہے جو اردو تحقیق و تدوین میں ایک بالکل نیا باب کھولتا ہے۔یہ حواشی دراصل ایک مستقل تحقیقی تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں۔دو سو چوہتر صفحات پر مشتمل یہ حواشی دو سو اکسٹھ مستند کتب و مآخذ سے مزین ہیں۔ان میں صرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح یا ملفوظات ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ، تصوف، فقہ، کلام اور تذکرہ نگاری کی معتبر کتابیں بھی شامل ہیں۔یوں یہ حواشی ایک طرح کی "موسوعۂ تحقیقیہ" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو محققین اور طلبہ کے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔الغرض، انیس المظاہر فی سیرت السید عبدالقادر جیلانی اردو سوانح اور دینی تاریخ نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کا متن ایجاز و اختصار کا شاہکار ہے، اس کی منظرنگاری وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے، اس کی تدوینِ جدید جدید اصولِ تحقیق کا نمونہ ہے اور اس کے حواشی محققانہ معیار کی سند ہیں۔

"حسبِ مراتب"(سیرت،سوانح،تنقید):

"حسب مراتب "سید مراتب اختر گیلانی کی سوانح عمری ہے۔ ادارہ صوت ہادی نے اسے دسمبر۲۰۰۶ءمیں شائع کیا۔یہ ساہیوال ڈویژن کے کسی شاعر پر لکھی جانے والی سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔اس کے مصنف سید سید علی ثانی گیلانی ہیں۔سادہ اور دلچسپ اسلوب بیان کی حامل کتاب ہے۔اردو ادب کی تمام سوانح عمری کی کتب کے بر عکس بالکل منفرد انداز میں لکھی گئی ہے۔ قاری اگر ایک بار پڑھنے لگے تو پوری کتاب پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔بالکل افسانوی انداز میں لکھی گئی ہے۔ابواب بندی کے بجائے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا حصہ "اک صد بہار یاد" دوسرا حصہ "خواب رفتگاں"اور تیسرے حصے کا عنوان "اوراق منتشر"رکھا گیا ہے۔یہ تقسیم محض فنی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ قاری کی سہولت کوسامنے رکھتے ہوئے کی گئی ہے تاکہ وہ واقعات کے تسلسل میں کھو جائے اور مصنف کی یادداشت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتا جائے۔یہ انداز ایسا ہے کہ ہر سطر کے بعد تجسس میں اضافہ ہوتا ہے اور قاری پورا متن مکمل کیے بغیر کتاب بند نہیں کر سکتا۔مصنف نے مراتب اختر گیلانی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نہایت باریک بینی سے اجاگر کیا ہے۔ان کی زندگی کی پرتیں گویا

سطر بہ سطر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی داستان گو کی محفل میں بیٹھا ہے جہاں واقعات اور کردار اپنی اصل حیات کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ یہ اسلوب محض بیانیہ نہیں بلکہ ایک طرح کا مکالمہ اور محاکات پیدا کرتا ہے جو سوانح نگاری کو محض ایک سادہ روداد سے بلند کر کے فن پارے میں ڈھال دیتا ہے۔ اول سے آخر تک تحریر میں ایک ادبی شان جھلکتی ہے۔ "حسبِ مراتب" کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے محض واقعات درج کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مراتب اختر گیلانی کی شاعری کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں موجود خیالات کی ندرت، محاسنِ کلام، اور اسلوب کی جدت کو نہایت فنی اور شائستہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تنقیدی مباحث، شاعر کے فکری ارتقاء، ادبی نظریات اور شعری محاسن کے لیے کوئی مستقل باب مختص کرنے کے بجائے انہیں واقعاتی تسلسل کے ساتھ مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ واقعات نگاری کے دوران میں ہی حسبِ موقع ان نکات کو سمو دیتا ہے، جس کے نتیجے میں بیان میں ایک ایسی ندرت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے جو اردو ادب میں تنقیدی اسلوب کی ایک منفرد جہت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ تنقیدی حصہ قاری کی دلچسپی کو دو چند کر دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گنجِ گفتار" میں ان کی شاعری کے تمام رنگ پورے طور پر عیاں ہوتے ہیں۔ تصورات کی رنگینیاں، پھولوں بھرے نشیب، برفوں بھرے فراز، ہری بھری جھیلیں۔ کہیں کہیں گنگ، سنسان، بلندی کے نوکیلے منظر اور کہیں شہلا اور ہمزاد کا تصور کہیں فصلوں کے کٹاؤ کے مناظر جبکہ کئی اشعار گھٹاؤں، بارشوں اور لالہ زاروں کے اشاروں اور استعاروں سے مہ پاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔"(۵)

اب یہ اوصاف مراتب اختر کی شاعری میں ملاحظہ ہوں:

پھولوں بھرے نشیب یہ برفوں بھرے فراز
یہ بادلوں کی چھاؤں، یہ منظر سفر میں ہے(۶)

اُڑتے ہوئے پرندے، ہری بھری جھیلیں
تکیے پر یہ منظر کس نے کاڑھا ہے(۷)

بوسے بچھڑے یا پھول کھلے اک بات لبوں تک آئی ہے
میں اپنا سب کچھ کھو بھی چکا تو پھر بھی چیز پرائی ہے
چکر ہیں زمیں کو، برفیلی سمتوں کا دسمبر بیت گیا
جسموں کے خوشے جھڑتے ہیں گرما کی گرم کٹائی ہے
ہمزاد یہ کس کی جیت یہ کس کی ہار ہوئی کچھ تو بھی بتا
یہ بات کہاں تک ٹھیک ہے جو لوگوں کے لبوں تک آئی ہے(۸)

یادیں برس برس گئیں نمدار گھاس پر
کیلے کے سبز پات ملے برشگال میں
بارش ذرا تھمی تو کھلے آسمان پر
غم کی دھنک کے رنگ کھلے برشگال میں(۹)
اب لوٹ آ، بدل گئی رُت، پھول کھل گئے
دیوار پر لٹکتی ہوئی زرد بیل میں(۱۰)
شوقِ شکار تو مجھے لایا ہے کس جگہ
مرغابیوں کے ڈار۔۔۔، گھٹا، نغمہ زار۔۔۔، پھول(۱۱)
طوفان کو ترستی ہے، طوفان کے باوجود
تصویر پر رُکی ہوئی اک بدنصیب ناؤ(۱۲)
مری قسم تجھے شہلا، نہ رو، نہ ہو بیتاب
ترے زوال کے یہ دن بھی بیت جائیں گے(۱۳)

ایک جگہ یہ لکھتے ہیں:

”آپ انسان کے پوری خلافت ارضی کے نظام کو سنبھالنے کے خواہاں تھے:
انسان! اے زمیں کی خلافت کے پاسبان
اٹھ، اور مہک، مہیب اندھیرے اجال دے(۱۴)

الغرض مصنف نے دلچسپ انداز میں مراتب اختر کے شعری افکار کو بھی بیان کیا ہے اور فنی تجزیہ بھی کیا ہے۔ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مصنف نہ صرف مراتب اختر کے بھتیجے اور مرید ہیں بلکہ خود تصوف کے اسرار و رموز سے بھی گہری شناسائی رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پوری کتاب میں عقیدت و محبت کی فضائے روح پرور نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس والہانہ عقیدت کے باوجود مصنف نے تحقیقی دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ بے لاگ انداز میں رقم طراز ہیں:

”یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ سید مراتب اختر کی تمام شاعری یکساں نہیں۔ کہیں کہیں درشتی، سنگلاخی اور کھردرا پن ضرور ہے بلکہ جا بجا ہے جو شعری نزاکتوں پر کبھی کبھی گراں گزرتا ہے اور روایتی حسنِ تغزل کو بھی متاثر کرتا۔“(۱۵)

حقیقت کے آئینے میں دیکھا جائے تو مراتب اختر کی شاعری میں یہ سختی اور کھردرا پن ان کی زندگی کے دو مختلف اور متضاد پہلوؤں کا عکس ہے۔ ایک طرف وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں گورنمنٹ کالج لاہور، اسلامیہ کالج لاہور، ایم اے او کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے

مشاعروں کی جان تھے۔ پروفیسر سجاد باقر رضوی کی سوسائٹی "ینگ رائٹرز" کے روحِ رواں، اساتذہ کی آنکھ کا تارا، پینٹ کوٹ میں ملبوس ماڈرن نوجوان، جدید تر غزل کے خالق اور لاہور کی رنگین فضاؤں کے اسیر تھے۔ دوسری طرف، یہی شاعر یکایک سب کچھ ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں بلکہ ایک ایسا مجاہدہ ہے جسے بڑے بڑے صاحبانِ ہمت کے لیے بھی آساں کام نہیں ہوتا۔ شوخ و شنگ شاعر جو کبھی یہ کہتا تھا:

یہ کون گزرا ہے لہرا کے عنبریں زلفیں
کہ سر بسر مہک اٹھا ہے رہگزارِ خیال(۱۶)

جو شاعر نہایت نازک احساسات، جمالیاتی شعور، نفسیاتی امور کو سمجھتا تھا، جو انسانی جذبات اور حسن کے باہمی تعلق کو باریک بینی سے محسوس کرتا تھا، جو لکھتا تھا:

جو تجھ سے پوچھے گی آکر میرا پتہ، اس کی
نظر میں شوخ ہنسی، زلف سُرمئی ہو گی(۱۷)
تجھ سے گلی کے موڑ پہ غیروں کے درمیاں
یوں سامنا ہوا ہے کہ فق ہو گیا ہوں میں(۱۸)
اب جن کی شادیوں کو زمانہ گزر گیا
ان لڑکیوں کی یاد بھی دل سے نکال دے(۱۹)
تو بھی تھی مجھ پہ فدا، میں نے بھی چاہا تجھ کو
تیرے ابا نے کہیں اور بیاہا تجھ کو(۲۰)

ایسا تصور صرف وہی ذہن پیدا کر سکتا ہے جو تخیل کی لطافت، اور اظہار کی نزاکت میں کمال رکھتا ہو۔ تاہم ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب شاعر کے دل میں زندگی کی رنگینیوں کا سحر ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ مکر و فریب کی دنیا جو کبھی اس کے لیے دل فریب نظارہ تھی، اچانک اجنبی اور بے معنی محسوس ہونے لگتی ہے۔ خیالوں کی یہی دنیا جو کبھی اس کے اشعار میں جلوہ گر تھی، اب اس کو کاٹنے لگتی ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک صدائے بیزاری اٹھتی ہے۔

اشعار سے بیاض کا اک اک ورق سجا
جب تک ہے زندگی یہی کارِ فضول کر(۲۱)

اور پھر اچانک شاعر خدا کے حضور یوں عرض کرتا ہے:

میں جا رہا ہوں اور کہیں راہ بھول کر
تو ہے میرا خدا تو دعائیں قبول کر(۲۲)

اور دعا کیسی:

مجھ کو کر دے بھرے زمانے میں
اے خدا اپنے نام پر تنہا(۲۳)

اور کبھی خدا کے حضور یوں عرض کرتا ہے:

اے حادث و قدیم
میں تھک چکا ہوں میرے گناہوں کا حساب کر
اے حادث و قدیم مجھے بار یاب کر(۲۴)

یہ دراصل اس لمحۂ انکشاف کی جھلک ہے جب شاعر نے دنیاوی رنگینیوں کے پسِ پردہ چھپی منافقت اور اس کے مکروہ چہرے کو پہچان لیا۔ وہ جان گیا کہ وہ اپنے رب سے بچھڑ گیا ہے، فروعی بحثوں میں الجھ کر اصل منصب سے دور ہو گیا ہے۔ اسی احساسِ زیاں کو اس نے یوں بیان کیا:

حق کو چھوڑ کر فروع میں الجھا ہوا ہوں میں　　　　سچ ہے کہ اپنے آپ سے بچھڑا ہوا ہوں میں(۲۵)

جب شاعر یہ جان لیتا ہے کہ وہ حق سے دور ہو گیا ہے، شاعر کا بان اضطراب میں محسوس ہوتا ہے، وہ حق سے دوری کے احساس میں مبتلا ہے، وہ حق کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی کھوئی ہوئی ذات کو پانا چاہتا ہے، یعنی شاعر واپسی چاہتا ہے اسے "ارجعی الی ربک" کی صدائیں سنائی دے رہی ہیں، وہ ان صداوں کو سن کہ کہہ اٹھتا ہے:

کون مجھے افلاک کے پار بلاتا ہے　　　　دل اس بھرے جہان سے بھر تا جاتا ہے(۲۶)

اور شاعر جب اپنے رب کی پکار پہ لبیک کہتا ہے تو وہ عام انسانی جذبوں سے بلند ہو کر کشف حقیقت کے اس عالم میں داخل ہوتا ہے، جہاں محسوسات عبادت بن جاتے ہیں اس لمحے اسے لگتا ہے کہ کائنات کے بے شمار پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ازلی سچائی جو اس کی نگاہ ظاہر سے اوجھل تھی، اب اس کے دل کے آئینے میں روشن ہو گئی ہے۔ اس کے دل پہ ایک انکشاف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ شُکر و وجد کی سرشاری میں اپنے دل کو مخاطب کر کے پکار اٹھتا ہے:

تو نے میرے لیے میرے دل، اے میرے رفیق!
آفاق کی حدود سے پردہ اٹھا دیا(۲۷)

جب شاعر ساری حقیقت جاں لیتا ہے تو وہ کہتا ہے:

آئے تھے جس طرف سے وہ اک دن ادھر گئے
برگد کا پیڑ کٹ گیا سادھو گزر گئے(۲۸)

اور جب شاعر فنا و بقا کی حققت دیکھ لیتا ہے تو کہتا ہے:

روح نے مرگِ بدن کا منظر دیکھ لیا
دیکھیں اسے کون آکر دفناتا ہے(۲۹)

اور آخری مقام پر لکھتا ہے:

پیوند اک اور زمیں کی ردا میں لگا دیا
میں حصہ فنا تھا، فنا سے ملا دیا(۳۰)

یہ فیصلہ کرنا قاری کا کام ہے کہ مراتب اختر کی شاعری میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ایسے شاعر سے یکسانیت کی توقع رکھنا عبث ہے۔جس نے عین شباب میں دنیا کی نیرنگیوں کو ترک کیا ہو، عشقِ الٰہی کی مئے نوشی سے سرشار ہوا ہو، اور محض چند برسوں میں "مراتب اختر" سے "مراتب غوث" تک کا روحانی سفر طے کرلیا ہو، اس کی شاعری میں کھردرا پن، درشتی اور سنگلاخی ایک خامی نہیں بلکہ اس کی شعری عظمت کا نشان ہے۔یہی وہ کڑواہٹ ہے جو دراصل صداقت کا ذائقہ ہے اور یہی وہ متانت ہے جو سچائی کی جلالت کو مہمیز دیتی ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ مراتب اختر کی شاعری میں یہ رنگ ان کے انقلابی مزاج اور روحانی سفر کی آئینہ دار خصوصیت ہے، جو نہ صرف ان کے کلام کو منفرد بناتی ہے بلکہ اردو شاعری میں حقیقت نگاری کے ایک نئے باب کی اساس بھی فراہم کرتی ہے۔اس تصنیف میں سوانح، تنقید اور افسانوی طرزِ بیان کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو اردو ادب میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔سید علی ثانی گیلانی نے جہاں ایک محقق کی طرح حقائق کو پیش کیا ہے وہیں ایک ادیب کی طرح انہیں رنگ و آہنگ بھی عطا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ "حسبِ مراتب" کو محض ایک سوانح عمری کہنا اس کے ادبی قد و قامت کو محدود کرنا ہوگا؛ یہ دراصل ایک فکری اور ادبی شاہکار ہے جو قاری کو نہ صرف مراتب اختر گیلانی کی شخصیت سے روشناس کراتا ہے بلکہ ان کے عہد کے معاشرتی و ادبی مزاج کا بھی آئینہ دار ہے۔"حسبِ مراتب "کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب محض ایک شخص کی سوانح نہیں بلکہ ایک عہد کی ادبی و تہذیبی تاریخ ہے جو مصنف نے نہایت نفاست، شائستگی اور تخلیقی ندرت کے ساتھ پیش کی ہے۔اس میں تحقیق کا وقار، تنقید کی بصیرت اور ادب کا حسن یکجا ہو گیا ہے۔یہی وہ اوصاف ہیں جو اسے اردو سوانح نگاری میں ایک سنگِ میل بناتے ہیں۔اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر کی خانقاہی اور روحانی حیثیت کو نظرانداز نہیں کیا گیا، بلکہ اس کے علمی و عرفانی پہلوؤں کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔یوں یہ کتاب مراتب اختر گیلانی کی شخصیت کو محض ایک ادبی پیکر میں نہیں بلکہ ایک صاحبِ حال بزرگ اور ولی اللہ کے طور پر بھی پیش کرتی ہے۔

"رائے احمد خان کھرل شہید" (تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء):

تاریخِ برصغیر خصوصاً پنجاب کی جدوجہدِ آزادی ایک ایسا باب ہے جس کے اوراق وقت کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئے تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی جب بھی تاریخ لکھی جاتی ہے تو دہلی اور یوپی کے واقعات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جبکہ پنجاب کی سرزمین پر اٹھنے والی عوامی تحریکوں کو حاشیے میں بیان کیا جاتا ہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء پر برصغیر میں کثیر قابل قدر تحریری مواد موجود ہے۔ بالخصوص دہلی، لکھنؤ، کانپور میرٹھ اور یوپی کے دیگر شہروں پر انگریز و ہندستانی مؤرخین نے وافر تحریریں لکھی ہیں۔ غلام رسول مہر کی کتاب "پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی" دھرمیندر ناتھ کی کتاب "دہلی اور آزادی"، مولانا ذکااللہ دہلوی کی "تاریخ جنگ آزادی"، سید قاسم محمود کی "تاریخ جنگ آزادی ہند" وغیرہ جنگِ آزادی کی ابتدائی رودادوں میں شمار ہوتی ہیں۔ انگریز مورخین نے باپنی تصانیف میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کو محض سپاہی بغاوت یا غدر کے طور پر پیش کیا ہے۔ اردو میں بعد کے دور میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محبوب حسین اور قاضی عبدالودود نے ۱۸۵۷ء کی تاریخ کو ایک منظم علمی پس منظر دیا ہے۔ ان تمام کاموں میں دہلی، لکھنؤ، میرٹھ اور یوپی کی سیاست و جنگی صورتِ حال کو زیادہ جگہ ملی جبکہ پنجاب کی عوامی مزاحمت کو یا تو نظر انداز کیا گیا یا برائے نام ذکر کیا گیا۔ پنجاب کے سیاق میں چند محققین نے کچھ کام ضرور کیا ہے لیکن ان کے ہاں رائے احمد خان کھرل اور ان کے ساتھیوں کا کردار ثانوی حیثیت میں آیا ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر منظم اور تحقیقی انداز میں کتابی صورت میں بہت کم کام سامنے آیا ہے۔ مقامی سطح پر اخباری مضامین یا مختصر رسائل میں رائے احمد خان کھرل کا ذکر ضرور ہوا مگر ایک جامع اور مستند تحقیق کی کمی محسوس کی جاتی رہی۔ یہی وہ خلا تھا جسے سید سید علی ثانی جیلانی نے اپنی گراں قدر تصنیف "رائے احمد خان کھرل شہید" (تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) کے ذریعے پُر کیا ہے۔ یہ تصنیف نہ صرف تاریخی جستجو کی آئینہ دار ہے بلکہ اس میں تنقید، تحقیق اور تجزیے کا وہ امتزاج ملتا ہے جو کسی بھی مستند تحقیقی کام کے لیے بنیادی شرط ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ کتاب اردو زبان میں رائے احمد خان کھرل شہید اور پنجاب کی جنگِ آزادی پر اولین جامع تحقیقی کاوش ہے۔ یہ کتاب محض ایک فرد یا ایک قبیلے کی تاریخ نہیں بلکہ برطانوی سامراج کے خلاف پنجاب کے قبائل، مجاہدین اور صوفی خانقاہوں کی عملی جدوجہد کا بیانیہ ہے۔ رائے احمد خان کھرل شہید، جو بظاہر ایک دیہی رہنما تھے، ان کے کردار کو مصنف نے اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ وہ برصغیر کی تحریکِ آزادی میں ایک نمایاں ہیرو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ تاریخ "مرآۃ الام" ہے یعنی یہ قوموں کا وہ آئینہ ہے جس میں ان کی عظمت و زوال کے تمام نقوش صاف جھلکتے ہیں۔ تاریخ کا کوئی باب ناانصافی یا غفلت کی گرد میں دب جائے تو اس کا نتیجہ قومی حافظے کی کمزوری اور شعور کی بے نوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پنجاب کے میدانوں اور بار کے علاقوں میں ۱۸۵۷ء میں جو شعلۂ حریت بھڑکا، وہ دہلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں

اگرچہ کم نمایاں دکھایا گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی شیرانِ بے خوف اپنی جانوں کی بازی لگا چکے تھے۔ انھی شیرانِ بے باک میں رائے احمد خان کھرل کا نام سرفہرست ہے، جو تاریخ کے اوراق میں "امیر الاحرار" اور "سردارِ بار" کے لقب سے محفوظ رہے گا۔ سید سید علی ثانی جیلانی کی تصنیف اس لحاظ سے سنگِ میل ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ رائے احمد خان کھرل کے کردار کو محض ایک "لوک ہیرو" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مستند تاریخی شخصیت کے طور پر ثابت کرنے کی سعی کی۔ کتاب کا مصنف محض مورخ نہیں بلکہ ایک صاحبِ بصیرت محقق اور مقالہ نگار ہے جس نے برصغیر کے تاریخی اور صوفیانہ تناظر کو یکجا کر کے ایک منفرد زاویہ فراہم کیا ہے۔ ان کے بقول: "میں مورخ نہیں بلکہ ایک مقالہ نگار ہوں" (۳۱)

یہ جملہ دراصل ان کی تحقیقی دیانت کا مظہر ہے کہ وہ اپنے کام کو تاریخ کا حتمی فیصلہ نہیں بلکہ علمی مکالمے کی ایک کاوش سمجھتے ہیں۔ اس سے ان کے علمی قد و قامت اور تحقیقی اخلاص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مصنف نے برصغیر کی عمومی تاریخ سے ہٹ کر علاقائی تاریخ نویسی کا وہ پہلو اجاگر کیا ہے جو اکثر نظر انداز ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے مقامی علاقوں مثلاً ضلع پاکپتن، گوگیرہ، شیخوشریف اور جھامرہ کے تاریخی پس منظر کو مربوط کر کے انھوں نے اس بات کو واضح کیا کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء محض چند شہروں کی بغاوت نہیں تھی بلکہ یہ ایک عوامی اور مزاحمت تھی جسے بزرگانِ دین کی تائید بھی حاصل تھی۔ یہ تصنیف ادارہ صوتِ ہادی، شیخوشریف (اوکاڑہ، پنجاب، پاکستان) کے زیر اہتمام ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی۔ کتاب ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے اور دس ابواب پر محیط ہے۔ بابِ اول میں جنگ آزادی کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے آغاز کو ایک نہایت نازک اور فکری زاویے سے دیکھا ہے۔ وہ اس بنیادی سوال کو اٹھاتے ہیں کہ آیا یہ واقعہ محض بغاوت تھا یا درحقیقت ایک تحریکِ حریت؟ مغل سلطنت کے زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظالمانہ اقتدار کے تاریخی پس منظر میں مصنف نے جس بصیرت سے دلائل فراہم کیے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریک آزادی کا فطری اظہار تھی، نہ کہ محض طاقت کے خلاف سرکشی۔ مصنف کے نزدیک اس جدوجہد کے ہر سپاہی کے دل میں غلامی کے خلاف وہی حرارت تھی جو ایک زندہ قوم کے خون میں دوڑتی ہے۔ بابِ دوم ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں برصغیر میں برپا ہونے والی اس عظیم ہلچل کے اسباب وعِلَل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے بغاوت کے مُحرِّکات، اس کی ابتدا، اور اس تحریک میں قیادت و مرکزیت کی کمی جیسے پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ حصہ قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اگر اس وقت قیادت متحد اور تنظیم مضبوط ہوتی تو برصغیر کی تاریخ شاید مختلف رخ اختیار کرتی۔ کتاب کے باب سوم میں مصنف علاقائی تاریخ نویسی کے ایک اہم مگر اکثر نظر انداز کردہ پہلو کو نہایت باریک بینی سے اجاگر کیا ہے۔ اس میں نہ صرف برطانوی حکومت کی انتظامی تقسیم پر تحقیقی نگاہ ڈالی گئی ہے بلکہ ڈویژن ملتان کے تاریخی خدوخال کو

بھی واضح کیا گیا ہے۔ اس عہد میں ملتان ڈویژن کے زیرِ انتظام تین بڑے اضلاع ملتان، جھنگ اور گوگیرہ شامل تھے۔ بعد میں پاکپتن کو بھی ضلع بنادیا گیا، ساہیوال اسی ضلع کا حصہ تھااور رائے احمد خاں کھرل شہیدؒ کی تحریک حریت انہی خطوں میں اپنی عملی جڑیں رکھتی تھی۔ مصنف نے اس باب میں واقعاتی بیان پر اکتفانہیں کیا بلکہ تاریخ کے ان دبے ہوئے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جو وقت کی گرد میں اوجھل ہوچکے تھے۔ انھوں نے علاقائی پس منظر کو محققانہ انداز میں کھنگالا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ قومی تحریکوں کی جڑیں ہمیشہ مقامی مٹی سے پھوٹتی ہیں۔ یہ خطے محض جغرافیائی اکائیاں نہیں تھے بلکہ یہ تحریک آزادی کے حقیقی محاذ تھے جہاں کے باسیوں نے اپنے لہو سے حریت کے چراغ جلائے تھے۔ چوتھے باب میں تحریکِ آزادی کے اُس مرکز کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جہاں سے اس تحریک کے عملی مظاہر کا آغاز ہوا، یعنی خانقاہِ شیخو شریف۔ یہی وہ روحانی مرکز تھا جس نے حریت و استقلال کی جدوجہد کو فکری و ایمانی توانائی بخشی۔ رائے احمد خاں کھرل شہیدؒ اسی خانقاہ کے مخلص مرید تھے، جنہوں نے اپنے پیر و مرشد کے حکم پر عمرِ رفتہ کے باوجود نوجوانوں کی طرح میدانِ عمل میں قدم رکھا۔ رائے احمد خاں شہیدؒ کے تمام رفقاء و ہمرکاب بھی خانقاہِ شیخو شریف کے وابستگان و عقیدت مند تھے، جنہوں نے اپنے مرشدِ برحق کی اجازت و رہنمائی کے تحت رائے صاحب کے شانہ بشانہ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ آج بھی اُن مجاہدین کے خاندان اسی روحانی نسبت پر قائم ہیں اور خانقاہِ شیخو شریف سے اپنی عقیدت و وابستگی کو فخر کے طور پر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں نہ صرف ان مجاہدینِ حریت کے کردار اور ان کی روحانی وابستگی کا ذکر ملتا ہے بلکہ اس علاقے میں رائج مختلف تاریخی و عوامی روایات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان روایات کو علمی معیار پر پرکھنے کے بعد دلائل و شواہد کی روشنی میں ان کی تاریخی اصالت کو واضح کیا گیا ہے۔ مزید بر آں، اس حصے میں مجاہدینِ آزادی کے شیخو شریف میں قیام، انگریز افواج کے حملے اور پیرانِ عظام کی حکیمانہ کارگزاریوں پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے، جو اس تحریک کے روحانی و تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ پانچواں باب "رائے شہید کے حلیف رؤسا، مسلمان مجاہدین" کے عنوان سے ہے۔ یہ باب مصنف کی تحقیقی بصیرت اور علاقائی تاریخ کی بازیافت کا نہایت اہم اور نمایاں حصہ ہے، جس میں تحریکِ آزادی کے مقامی ہیرو، رائے احمد خان کھرلؒ کی قیادت، مجاہدانہ جراءت اور روحانی وابستگی کا تفصیلی نقشہ نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ مردِ آہن تھے جنہوں نے اپنی اکیاسی برس کی عمر میں، مرشدِ برحق کے حکم پر جہاد کا عَلَم بلند کیا اور بالآخر حالتِ نماز میں جامِ شہادت نوش کیا۔ ان کی گردن قلم کرکے گوگیرہ جیل کے دروازے پر لٹکائی گئی، مگر ان کا نام تاریخ کے ماتھے کا ایسا جھومر بن گیا جو ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ مصنف نے اس باب میں رائے احمد خان کھرلؒ کے ساتھ اُن تمام جانبازوں کے تعارف اور کارناموں کو بھی نہایت تحقیقی و تاریخی استناد کے ساتھ محفوظ کیا ہے، جنھوں نے انگریز استعمار کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا۔ ان میں سارنگ، محامد کاٹھیا، نتھو کاٹھیا، نادر شاہ قریشی، مراد

فتیانہ، امانت علی چشتی، بابا نگاہی شاہ چنیوٹی، ولی داد مردانہ بلوچ، سوجا بھدرو، جلاترہانہ، موکھا وہنیوال، رجب وہنیوال اور دیگر مجاہدین شامل ہیں جنھوں نے آزادی کی شمع روشن کی۔ مصنف نے ان تمام کرداروں کی جدوجہد، ان کی علاقائی حیثیت، باہمی رفاقت اور قیادت کے زیرِ سایہ ہونے والے معرکوں کو تاریخی شواہد، زبانی روایات اور دستاویزی دلائل کی بنیاد پر مدلل انداز میں پیش کیا ہے، جو اس باب کو تحقیقی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت عطا کرتا ہے۔ مزید برآں، مصنف نے نہ صرف آزادی کے ان علمبرداروں کا ذکر کیا ہے بلکہ اُن عناصر کو بھی بے خوفی اور تحقیقی دیانت کے ساتھ آشکار کیا ہے جو اُس زمانے میں انگریز سامراج کے وفادار اور رائے احمد خان کھرلؒ کے مخالف تھے۔ ان میں سرفراز خان کھرل، صادق محمد خان، مراد شاہ، مخدوم شاہ محمود قریشی، پاک پتن کے مخادیم، ماچھیا نگھڑیال، بہاول نگھڑیال، میاں جیوے خان، مراد شاہ شیرازی، سردار شاہ شیرازی اور گلاب علی چشتی کے نام نمایاں ہیں۔ مصنف نے ان تمام کرداروں کی وفاداریوں، انعامات اور جاگیروں کا ذکر بھی تنقیدی بصیرت کے ساتھ کیا ہے تاکہ تاریخ کے دونوں رُخ وفاداری اور مزاحمت یکساں وضاحت سے قاری کے سامنے آئیں۔ اسی تسلسل میں مصنف نے انگریز کے غیر مسلم حامیوں، بالخصوص ہندو اور سکھ وفاداروں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے مقامی تحریکِ آزادی کو دبانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان میں دھارا سنگھ، نہال سنگھ، ڈانگی سنگھ، کھیم سنگھ، سپورن سنگھ بیدی، کھنیا رام اروڑا، ماچھی سنگھ اروڑا اور جماعت سنگھ کھتری شامل ہیں۔ مصنف نے ان سب کا تذکرہ کسی تعصب یا معاندت کے بغیر محض تاریخی امانت کے طور پر کیا ہے، تاکہ آزادی کی تحریک کے اصل مزاحمتی تناظر کو اس کے مکمل تاریخی و سماجی سیاق میں سمجھا جا سکے۔ یوں پانچواں باب، ایک طرف رائے احمد خان کھرلؒ اور ان کے رفقائے کار کی جدوجہدِ آزادی کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے، تو دوسری جانب اُس دور کے سماجی تضادات، روحانی اثرات، سیاسی وابستگیوں اور وفاداریوں کے تنقیدی مطالعے کے ذریعے برصغیر کی تحریکِ آزادی کے مقامی پس منظر کو نئی تحقیقی جہت فراہم کرتا ہے۔ کتاب کا چھٹا باب "رائے صاحب کے احوال و آثار" یہ باب مصنف کی تحقیق و مشاہدہ کی روح ہے۔ اس باب میں رائے احمد خان کھرل شہیدؒ کی حیاتِ مستعار کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری نہ صرف ایک تاریخی کردار سے متعارف ہوتا ہے بلکہ ایک زندہ اور متحرک روح کے مشاہدے سے گزرنے لگتا ہے۔ یہ باب محض سوانح کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں ایک عہد کی سیاسی، فکری اور اخلاقی حرارت سمٹ آئی ہے۔ مصنف نے اس باب میں تحقیقی دیانت اور ادبی لطافت کو یکجا کر کے ایک ایسا تاثر قائم کیا ہے جو تاریخ کے بیان سے زیادہ کردار کی تفہیم کا سامان مہیا کرتا ہے۔ باب کا ابتدائی حصہ پس منظر، آئندہ نسل اور وطنِ اصلی جیسے اجزاء پر مشتمل ہے جو قاری کو اس خانوادے کی جغرافیائی اور نسلی جہتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ مصنف نے نام و نسب اور حسب و نسب کی تحقیق میں محض روایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دستاویزی

حوالوں سے اسے مدلل کیا ہے۔رائے احمد خان شہیدؒ کی ولادت، تعلیم و تربیت اور اساتذہ کے گھرانے کے بیان میں مصنف نے اس عہد کے علمی و سماجی ماحول کو بھی ساتھ ساتھ اجاگر کیا ہے۔یہ انداز محقق کے اس شعور کی علامت ہے جو کسی فرد کی سوانح کو اس کے زمانے کے تناظر میں دیکھنے کا ہنر جانتا ہے۔اخلاق و عادات اور شکل و شبہات کا بیان محض تعریفی پہلو نہیں رکھتا بلکہ کردار کی داخلی ساخت اور مزاجی ٹھہراؤ کو نمایاں کرتا ہے۔ باب کے اگلے حصے میں پیر و مرشد اور بیعت کے عنوان کے تحت رائے احمد خان شہیدؒ کی روحانی وابستگیوں پر بحث کی گئی ہے۔مصنف نے اس تعلق کو محض عقیدت کا مظہر نہیں بلکہ ایک فکری ہم آہنگی اور روحانی تربیت کا باب قرار دیا ہے۔یہی وہ نکتہ ہے جہاں رائے شہید کی اپنے مرشد سے محبت و یگانگت ایک اعلیٰ روحانی درجہ اختیار کر لیتی ہے، اور ان کی عملی زندگی میں استقامت وجراءت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔اسی باب میں سماجی خدمت، سرکاری ودرباری اثر و رسوخ اور عوامی روابط پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔مصنف نے رائے احمد خان کو محض ایک جنگجو یا مزاحمت کار نہیں بلکہ ایک باشعور سماجی کارکن کے طور پر متعارف کرایا ہے، جو اپنی قوم کے دکھوں کو محسوس کرتا اور ان کے ازالے کی کوشش کرتا تھا۔جنگ کے حالات و واقعات اور شہادت کے عنوانات میں بیان کا انداز ایک تاریخی دستاویز کی طرح ٹھوس، مستند اور مدلل ہے۔ مصنف نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مقامی تناظر میں رائے احمد خان کی قیادت کو نہایت توازن کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہاں مراد فتیانہ اور برکلے کے قتل کے واقعات کو محض داستانی رنگ دینے کے بجائے تحقیق کی میزان پر پرکھا گیا ہے۔بعد ازاں رائے شہید کے سر کی کہانی، مزار، محلِ وقوع اور ازواج و اولاد جیسے عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ نامورانِ اولادِ رائے شہیدؒ اور اولاد کے سکونت پذیر علاقوں کی تفصیل ایک تاریخی تسلسل کا احساس دلاتی ہے، گویا رائے احمد خان شہیدؒ آج بھی اپنے نام لیواؤں کی صورت میں تاریخ کے سینے پر زندہ ہیں۔آخر میں اسبابِ صلح کی بحث نہایت بصیرت افروز ہے۔الغرض، چھٹا باب نہ صرف ایک شخص کی سوانحِ حیات ہے بلکہ ایک عہد کی تاریخ، ایک قوم کی غیرت اور ایک روحانی سلسلے کی معنوی وراثت کا جامع مرقع ہے۔مصنف نے اسے جس تحقیقی نزاکت اور ادبی چابک دستی سے قلم بند کیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ”رائے صاحب کے احوال و آثار“ دراصل ایک انسان کی کہانی نہیں، ایک عہدِ مقاومت کی تعبیر ہے۔کتاب کا ساتواں باب ”فارسی خطوط“ مصنف کے تحقیقی شعور، تاریخی فہم، اور ماخذی استناد کا مظہرِ اتم ہے۔یہ باب اس کتاب کی روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں رائے احمد خان کھرل شہیدؒ کے عہد کی سیاسی کشمکش اور استعماری طاقتوں کی خفیہ حکمتِ عملی کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ان خطوط کی حیثیت محض خط

و کتابت نہیں بلکہ ایک عہد کی ذہنی و سیاسی دستاویز کی ہے، جو اس زمانے کی سفارتی چالوں اور داخلی دباؤ کی گہرائیوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ان فارسی خطوط میں رئیسانِ ممدوٹ کی جانب سے رائے احمد خان کھرل کو مسلسل تلقین کی گئی کہ وہ "انگریز بہادر" کے وفادار رہیں اور اپنے اثر ونفوذ کے زیرِ سایہ کاٹھیہ، بھروانہ، وٹو، جپے، ہرل اور کھرل جیسے تمام اہم قبائل کو بھی انگریز حکومت کی وفاداری پر آمادہ کریں۔اس میں برطانوی حکومت کے وہ سرکاری مکتوبات بھی شامل ہیں جو رئیسانِ ممدوٹ کو ارسال کیے گئے، جن میں بارہا یہ ہدایت دی گئی کہ وہ رائے احمد خان کو انگریز حکومت کی وفاداری پر آمادہ کریں۔مصنف نے ان خطوط کو محض تاریخی شواہد کے طور پر نہیں پیش کیا بلکہ ان کے بین السطور معانی کو کھول کر بتایا ہے کہ یہ محض وفاداری کی تلقین نہیں بلکہ انگریزوں کی سیاسی اضطراب کی علامت ہیں۔یہ خطوط دراصل اس خوف کا اظہار یہ ہیں جو انگریز حکومت کو رائے احمد خان کھرل جیسے بااثر اور متحرک قائد سے تھا۔اس باب کی سب سے بڑی علمی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خطوط پہلی مرتبہ دلائل و حوالہ جات کے ساتھ کسی مستند کتاب میں پیش کیے گئے ہیں۔اس سے قبل متعدد مورخین ان خطوط کی موجودگی کے باوجود ان تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔مصنف کی یہ کاوش اس لحاظ سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے تاریخ نویسی میں محض روایت یا منقولات پر تکیہ نہیں کیا بلکہ تحقیقی تتبّع، ماخذی استناد اور دستاویزی شواہد کی روشنی میں حقائق کو آشکار کیاہے۔مصنف نے واضح کیا ہے کہ یہ تمام خطوط محکمہ دستاویزات و کتب خانہ جات، حکومتِ پنجاب لاہور کے ریکارڈ کا حصہ ہیں۔یہ امر بذاتِ خود مصنف کی تحقیقی دیانت اور جستجوئے حق کی دلیل ہے۔ان خطوط کو اس سے پہلے منظرِ عام پر نہ لانے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ ان سے رائے احمد خان کھرل اور انگریز حکومت کے مابین رابطے کا ایک پہلو سامنے آتا تھا، جس سے بعض لوگ ان کی شخصیت میں وفاداری کے شک کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔تاہم، مصنف نے نہایت فکری متانت سے یہ واضح کیا کہ ان خطوط کا منظرِ عام پر آنا رائے احمد خان کی شخصیت کو کمزور نہیں کرتا بلکہ مزید مضبوط بناتا ہے۔یہ خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ انگریز حکومت آغاز ہی سے رائے صاحب کی وجاہت اور عوامی اثر سے خائف تھی۔وہ انھیں خوشامد، تعلقات اور رسمی وفاداری کے پردے میں رکھ کر زیرِ اثر لانا چاہتی تھی، کیونکہ دریائے راوی کے کنارے بسنے والے قبائل کی نگاہ میں رائے احمد خان کھرل کی عزت و وجاہت مسلم تھی۔یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے ان کے گرد نرم الفاظ کا جال بچھایا تاکہ ایک ممکنہ بغاوت کو وفاداری میں بدلا جا سکے۔دوسری جانب مصنف نے اس نکتے پر نہایت حکیمانہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ رائے احمد خان کھرل محض سیاسی لیڈر نہیں بلکہ ایک صاحبِ نسبت مردِ مؤمن

تھے۔ان کی زندگی شریعت و طریقت دونوں کے اصولوں سے منسلک تھی۔وہ اپنے پیر و مرشد کے حکم کے پابند تھے، اور جب تک جہاد کا حکم صادر نہیں ہوا، وہ خاموش رہے۔رئیسان ممدوٹ کو بھی مراسلہ لکھ کے مطمئن کر دیااور انگریز حکومت کو بھی لیکن جب حکمِ مرشد آ گیا، تو دنیاوی مصلحتوں اور انگریزوں کی پیش کردہ مراعات کو ٹھکرا کر جہاد کا علم بلند کر دیا۔یہی وہ لمحہ تھا جب ان کی وفاداری کسی حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ حق و صداقت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ایک اور اہم بات خطوط کی تاریخ پر غور کرتے ہوئے ایک نہایت اہم تاریخی نکتہ سامنے آیاہے۔ان خطوط کی تحریر ۱۸۴۸ء کی ہے، جبکہ گوگیرہ کو انگریز حکومت نے اپنا صدر مقام ۱۸۴۹ء میں بنایاتھا۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے پہلے رائے احمد خان کھرل کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کی، اور جب انہیں کچھ اطمینان حاصل ہوا تو انہوں نے گوگیرہ کو انتظامی مرکز قرار دیا۔الغرض، بابِ ہفتم نہ صرف فارسی خطوط کی اشاعت کا باب ہے بلکہ تحقیقی دیانت، تاریخی استناد اور فکری بصیرت کی ایک روشن مثال بھی ہے۔مصنف نے یہ واضح کر دیا کہ تاریخ نویسی محض ماضی کی نقل نہیں بلکہ حال کی فہم کا ذریعہ ہے۔ رائے احمد خان کھرل کی شخصیت ان خطوط سے ماند نہیں پڑتی بلکہ اور بھی تابندہ ہو جاتی ہے۔وہ وفاداری اور بغاوت کے درمیان نہیں بلکہ ایمان اور ضمیر کے درمیان فیصلہ کرنے والے مردِ حُر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔مصنف کی یہ کاوش بجا طور پر تاریخِ پنجاب اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مطالعے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔آٹھویں باب میں مصنف نے ایک بالکل نیا تحقیقی زاویہ پیش کیا ہے۔انھوں نے پنجاب کی ثقافتی تاریخ میں 'ڈھولے"کی روایت کو بطور زبانی تاریخ متعارف کروایا ہے۔مصنف نے قدیم عربی میلوں میں پڑھے جانے والے اشعار اور پنجابی ڈھولوں کے اسلوب کا موازنہ کر کے یہ واضح کیاہے کہ عوامی شاعری بھی ایک زندہ تاریخی ماخذ ہو سکتی ہے۔تاہم وہ علمی دیانت داری سے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ڈھول تاریخی سند نہیں، بلکہ عوامی احساسات کا عکس ہیں۔زیرِ نظر باب میں مصنف نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ پنجاب کی قدیم ثقافت میں "ڈھولے" محض عوامی نغمات یا رومانوی حکایات نہیں، بلکہ ایک زندہ تہذیبی ورثہ اور تاریخی روایت کا تسلسل ہیں۔یہ ڈھولے دراصل اس خطۂ پنجاب کی زبانی تاریخ کے امین ہیں، جنہوں نے نسلاً بعد نسل اپنے اندر اُس عہد کی سیاسی، سماجی اور جذباتی کیفیات کو محفوظ رکھاہے۔یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ جس طرح عربوں نے اسواقِ عکاظ جیسے میلوں میں اپنی شاعری اور خطابت کے ذریعے اپنی تہذیب، زبان، حسب و نسب اور قومی وقار کو دوام بخشا، بعینہٖ پنجاب کے قصہ گویان اور اہلِ فن نے میلوں، اجتماعات اور درگاہوں کے سائے تلے اپنے فکری و ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کا فریضہ انجام دیا۔ان محافل میں زبان و بیان کی جولانی، نغز

گوئی اور عوامی ذوق کی رعایت مل کر ایک ایسا ادبی مزاج تشکیل دیتی ہیں جو بظاہر عامیانہ لیکن فی الحقیقت تہذیبی شعور کی آئینہ دار ہے۔ مصنف نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان ڈھولوں میں مبالغہ، داد و دہش کی تمنا اور عوامی پسندیدگی کا عنصر اگرچہ نمایاں ہے، تاہم یہ پہلو ان کے ثقافتی صداقت نامے کو مجروح نہیں کرتا۔ یہی ڈھولے دراصل اس خطے کے عوام کے ترجمان اور آئینۂ ایام ہیں، جو ایک زندہ تہذیب کی دھڑکنوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہ ڈھولے محض پنجاب کی لوک روایت کا حصہ نہیں بلکہ رائے احمد خان کھرل شہیدؒ کی شجاعت، غیرت اور حریتِ فکر کے نغمۂ جاوداں ہیں۔ ان میں اُس عہد کے جنگی حالات، رائے صاحب اور اُن کے رفقائے کار کی بہادری و جانبازی، اور انگریز سامراج کے خلاف اُن کی سر فروشانہ جدوجہد کو لوک زبان میں اس طرح سمیٹا گیا ہے کہ یہ ڈھولے ایک زندہ تاریخی دستاویز بن گئے ہیں۔ رائے صاحب کی شہادتِ حق کے بعد اُن کے انتقام اور خونِ ناحق کے بدلے کے واقعات بھی انہی ڈھولوں میں امر ہو گئے ہیں۔ عوامی حافظے نے ان داستانوں کو اس شدتِ جذب و عقیدت سے سنبھالا ہے کہ یہ آج بھی پنجاب کے کھیتوں، میلوں اور درگاہوں میں گونجتے ہیں۔ ان ڈھولوں میں کہیں حماسی نعرۂ حریت سنائی دیتا ہے، کہیں عشق و وفا کی للکار، اور کہیں وہ صدائے احتجاج جو محکوم اقوام کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ یوں یہ ڈھولے صرف شعری تخلیقات نہیں بلکہ لوک ادب کے آئینہ میں مزاحمتی تاریخ کا مظہر ہیں، جہاں فن، عقیدت اور حریت ایک ہی لَے میں ہم آہنگ ہو کر رائے احمد خان شہیدؒ کے کردار کو ابدی ضمیرِ قوم کی صورت میں زندہ رکھتے ہیں۔ مصنف نے قارئین کی سہولت کے لیے ہر ڈھولے کا اردو ترجمہ بھی فراہم کیا ہے، جو اس باب کی ادبی لطافت میں اضافہ کرتا ہے۔ نہم باب میں مصنف نے غیر معمولی محنت اور تحقیقی دقتِ نظر سے رائے احمد خان کھرل کے نسب نامے اور اولاد کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔ رائے شہداد خان سے لے کر رائے فخر عباس ایڈووکیٹ، رائے حیدر علی اور ان کی ہمشیر گان تک سلسلۂ نسب کی یہ ترتیب محققانہ عرق ریزی کی مظہر ہے۔ یہ کام نہ صرف خاندانی تسلسل کا ثبوت ہے بلکہ علاقائی تاریخ کی تدوین میں ایک نادر اضافہ بھی ہے۔ آخری باب میں مصنف نے تصاویر، مقامات، شخصیات، اور مستند دستاویزات کو مختصر مگر جامع تعارف کے ساتھ شامل کیا ہے۔ یہ ضمیمہ جات کتاب کو بصری اور علمی دونوں سطحوں پر بھرپور بناتے ہیں اور قاری کو محض متن نہیں بلکہ عینی شواہد فراہم کرتے ہیں۔ ہر باب نہ صرف تاریخی شواہد اور حوالہ جات سے مزین ہے بلکہ مصنف نے زبانی تاریخ، علاقائی ڈھولوں، خطوط، مقامی روایتوں اور شجرہ ہائے نسب کو بھی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔ اس سے کتاب کو محض تاریخی بیان سے نکال کر ایک کثیر الجہتی تحقیقی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ابواب کی ترتیب اور موضوعات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مصنف نے تاریخ کو محض واقعاتی سلسلہ

نہیں سمجھا بلکہ سماجی، سیاسی، ثقافتی اور خانقاہی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور قیامِ پاکستان میں خانقاہ شیخو شریف کا کردار":

برِّصغیر کی تاریخ اپنے دامن میں علم و عرفان، جہاد و حریت، اور تصوف و سیاست کے وہ پہلو سمیٹے ہوئے ہے جو کسی بھی قوم کی روحانی بیداری اور ملی غیرت کے مظاہر کہے جا سکتے ہیں۔ انہی تابندہ نقوش میں سے ایک خانقاہِ شیخو شریف ہے، جس نے نہ صرف جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں اپنے کردار سے تاریخ کے اوراق روشن کیے بلکہ قیامِ پاکستان تک ملی شعور کی شمع فروزاں رکھی۔ سید سید علی ثانی گیلانی کی یہ تصنیف، جس کی اشاعت ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ (۲جون ۲۰۱۹ء) کو عمل میں آئی، دراصل اس خانوادۂ قادریہ کی علمی و روحانی خدمات کو تاریخ کے آئینے میں از سرِ نو زندہ کرنے کی ایک علمی کاوش ہے۔ مصنف نے جس دقتِ نظر، ضبطِ تحقیق، اور سلیقۂ بیان سے اس موضوع کو قلم بند کیا ہے، وہ اسے محض ایک تاریخی بیان نہیں بلکہ ایک علمی وثیقہ بنا دیتا ہے۔ مصنف نے آغاز میں ایک نہایت اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ خانوادۂ گیلانیہ قادریہ شیخو شریف کی تاریخی و سیاسی خدمات عام طور پر منظرِ عام پر نہ آ سکیں۔ اس کا سبب ایک طرف خانقاہی تواضع و عزلت پسندی تھی، دوسری جانب مورخین کی بے اعتنائی۔ مصنف اس خاموشی کو توڑنے کے لیے اپنی کتاب کو ایک تحقیقی فریضہ سمجھتے ہیں، تاکہ اہلِ وطن اس روحانی خانوادے کے کردار سے آگاہ ہو سکیں جس نے الحادِ اکبری سے لے کر قیامِ پاکستان تک اپنی مساعیِ جمیلہ سے ملتِ اسلامیہ کی حفاظت کی۔ یہ تصنیف روحانی تسلسل کی ایک داستان ہے، جس میں شیخو شریف کی خانقاہ ایک مرکزِ ہدایت کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا کردار سلطنتِ مغلیہ کے زوال سے لے کر تحریکِ پاکستان کے عروج تک ایک روحانی رشتہ قائم رکھتا ہے۔ سید علی ثانی گیلانی نے تحقیقی مواد جمع کرنے میں تحریری شواہد، روایاتِ خانقاہی، تاریخی حوالہ جات اور عینی دستاویزات سے استفادہ کیا ہے۔ اسلوب میں تاریخی صداقت کے ساتھ ساتھ ادبی شائستگی کا امتزاج نمایاں ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر علمی متانت اور فکری توازن سے مملو ہے۔ انھوں نے ہر باب میں تاریخی واقعات کا تحقیقی تجزیہ کیا ہے، جس سے کتاب کی حیثیت ایک جامع مقالہ کی سی ہو جاتی ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک سلاطینِ وقت کی کمزوری، داخلی غداری، اور مذہبی انحراف نے ریاست کو کمزور کیا۔ مصنف نے اس تناظر میں حضرت امام حیدر بخش لاہوری اور حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں (بانی شیخو شریف) کے کردار کو واضح کیا ہے، جنہوں نے سکھوں کی حمایت سے انکار کیا اور ہجرت کو ترجیح دی۔ یہی ہجرت بعد ازاں شیخو شریف کے قیام کا پیش خیمہ بنی۔ مصنف نے اس باب میں نہایت عالمانہ انداز میں جہاد، ہجرت اور روحانی استقامت کے باہمی ربط کو اجاگر کیا ہے، جو اس خانوادے کی فکری اساس قرار پاتا ہے۔ اس باب میں مصنف نے سکھ فسادات اور ان کے نتیجے میں برپا ہونے والے ظلم و ستم کی دل سوز تاریخ کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس

پس منظر میں سید حسن بخش کی وہ جرأت مندانہ جدوجہد بھی نمایاں کی گئی ہے جو انھوں نے ظلم وبربریت کے خلاف جہاد کے طور پر کی۔انھوں نے مظلوموں کے دفاع اور حق کی سربلندی کے لیے جو عملی اقدام اٹھائے، وہ تاریخ کے اوراق میں ایمان، حمیت اور استقلال کی ایک روشن مثال کے طور پر محفوظ ہیں۔ تاہم، افسوس ناک امر یہ ہے کہ اپنے ہی ہم وطنوں کی غداری اور نفاق نے ان کی ان مساعی کو ناکامی سے دوچار کردیا۔ نتیجتاً، حالات کی سنگینی نے انہیں ترکِ وطن پر مجبور کیا، اور یوں ان کی ہجرت نے ایک نئے عہد "قیامِ شیخو شریف " کی بنیاد رکھی، جو بعد ازاں روحانیت، علم اور اصلاحِ معاشرہ کا مرکز بن گیا۔ دوسرے باب میں سید عبدالقادر گیلانی (سجادہ نشین دوم) کے حالات بیان کرتے ہوئے مصنف نے جنگِ پلاسی، انگریزی تسلط، اور مقامی مزاحمت کے عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے نزدیک اس دور کی سب سے بڑی آزمائش یہ تھی کہ دین وسیاست کے مابین توازن برقرار رکھا جائے۔ خانقاہِ شیخو شریف نے اس موقع پر روحانی قیادت اور سیاسی بصیرت دونوں کا مظاہرہ کیا۔ مصنف نے حوالہ جاتی انداز میں یہ ثابت کیا کہ خانقاہ نے انگریز اقتدار کے خلاف فکری مزاحمت کے بیج بوئے۔ اب جتنی میں نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد تحقیق کی ہے اس کے مطابق مصنف کے تمام دعوے درست ثابت ہوتے ہیں اس امر کی سب سے مضبوط اور ناقابلِ تردید دلیل پیش کرتاہوں کہ تاریخی و جغرافیائی حقائق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ابتدا میں برطانوی استعمار نے ضلع کا ہیڈکوارٹر پاکپتن میں قائم کیا تھا۔ تاہم، کچھ ہی عرصے بعد اسے ایک نسبتاً غیر معروف اور غیر مرکزی مقام، گوگیرہ، منتقل کر دیا گیا تمام معتبر مورخین اس امر پر متفق ہیں۔ یہ مقام چھ کلومیٹر کے فاصلے پر شیخو شریف کے قریب واقع ہے۔ یہ فیصلہ بظاہر انتظامی تبدیلی کا مظہر دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت اس کے پسِ پردہ سیاسی و عسکری حکمتِ عملی کارفرما تھی۔ انگریز حکومت نے اس تبدیلی کے ذریعے دراصل اس خطے کے روحانی و سماجی مرکز، شیخو شریف، پر قریبی نظر رکھنے کا ارادہ کیا کیوں کہ انگریز کی اس خطے پر گہری نظر تھی اور شیخو شریف کے مشائخ کے اصل نقطہ نظر سے وہ واقف ہو چکے تھے۔ برطانوی حکام بخوبی آگاہ تھے کہ لاہور سے لے کر ملتان تک کے اکثر قبائل اور زمیندار طبقات شیخو شریف کے مشائخ سے عقیدت و نسبت رکھتے ہیں، اور یہ خانقاہ محض روحانیت کا مرکز نہیں بلکہ ایک مضبوط فکری و عملی مزاحمتی قوت بنتی جارہی ہے۔ انگریزوں کی فریب کاری کی ایک نمایاں مثال یہ بھی ہے کہ علاقے کے سب سے بااثر رئیس، رائے احمد خاں کھرل جو شیخو شریف میں مرید تھے اور فنافی الشیخ تھے ان کو ملتان کے حکام کے ذریعے خطوط لکھوائے گئے تاکہ وہ انگریزوں کی وفاداری اختیار کریں۔ یہ خطوط بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ سفارتی چال دراصل علاقے کی مزاحمتی قوتوں کو توڑنے کی کوشش تھی۔ ہیڈکوارٹر کو شیخو شریف کے قریب منتقل کرنے کا مقصد واضح تھا، اس مرکزِ روحانیت اور

آزادی کے مرکز پر قریبی نگرانی رکھنا، اس کے گرد جاسوسی کا جال پھیلانا، اور انگریز دشمن قوتوں کی سرگرمیوں کو ابتدا ہی میں دبانا۔یوں گوگیرہ کی یہ بظاہر معمولی منتقلی دراصل ایک گہری نوآبادیاتی تدبیر تھی، جس کے ذریعے انگریز سامراج نے شیخو شریف کے روحانی وقومی اثر کو محدود کرنے کی منظم کوشش کی۔تیسرے باب میں مصنف نے سجادہ نشینِ چہارم، حضرت سید عبدالرزاق گیلانی(مرشدِ رائے احمد خاں شہید)کی تعلیمات، روحانی قیادت اور تحریکِ آزادی میں ان کے کردار پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے۔مصنف کے مطابق جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بیشتر مجاہدین اور قبائل اسی مردِ حق کے مرید اور تابع فرمان تھے، جنہوں نے اپنے مرشد کے حکم پر رائے احمد خاں شہید کے ہم رکاب ہو کر جہاد میں حصہ لیا۔اس باب میں مصنف نے مغلیہ سلطنت کےزوال اور اس کے نتیجے میں برصغیر میں پیدا ہونے والی سیاسی و مذہبی فضا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔بعد ازاں فتویٰ فرضیتِ جہاد کے صدور کے بعد مجاہدین کی عملی جدوجہد اور قربانیوں کو مستند حوالوں سے بیان کیا گیا ہے۔اس ضمن میں شیخو شریف اور گوگیرہ میں ہونے والے معرکوں کے ٹھوس تاریخی دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔مصنف نے میاں جیوےخاں کا ذکر بھی کیا ہے، جو علاقے کی بااثر آدمی تھا۔ابتدا میں شیخو شریف ہی کے مریدوں میں شامل تھا، مگر انگریز کی چالوں میں آ کر اس کا ساتھی بن گیا۔دراصل انگریز نہایت چالاک اور مکار تھا، جس نے پنجاب کے تمام مزاحمتی قبائل کی تفصیلات سکھوں کے محفوظ ریکارڈ سے حاصل کی تھیں۔ان ریکارڈز سے یہ امر واضح ہوتا تھاکہ بانیِ خانقاہِ شیخوشریف، سید حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں سکھوں کے وفادار نہیں تھے بلکہ ان کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے تھے، اگرچہ کامیابی ان کے مقدر میں نہ تھی۔یہی وجہ تھی کہ انگریز حکومت نے پورے خطے میں سب سے زیادہ نظر خانقاہِ شیخو شریف پر رکھی اور اس کے وابستگان کو اپنے ساتھ ملانے کی مختلف کوششیں کیں۔انگریز نے رائے احمد خاں کو اپنے مفاد میں خطوط لکھوائے اور میاں جیوے خاں کو قریب کیا، مگر رائے احمد خاں شہید نے مرشد کے حکم اور فریضۂ جہاد کو ہر دنیاوی مفاد پر ترجیح دی۔اس کے بعد مصنف نے مجاہدینِ شیخو شریف اور انگریز فوج کے درمیان آخری معرکوں، مجاہدین کاشیخوشریف میں قیام، پیران عظام کاانگریزکے سامنے ڈٹ جانا، رائےاحمدخاں کی شہادت،برکلے کے قتل کے واقعات، مجاہدین کی گرفتاریوں اور کالاپانی کی سزاؤں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔نیز یہ بھی واضح کیا کہ ساداتِ شیخو شریف کو سزا کے طور پر ان کی تمام جاگیریں اور املاک ضبط کر لی گئیں۔ان تمام دعووں کو مصنف نے معتبر تاریخی دلائل سے ثابت کیا ہے۔باب کے اختتام پر مصنف نے صلح کی وجوہات پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے اور چند تنقیدی مباحث بھی پیش کیے ہیں۔ان مباحث میں انہوں نے بالخصوص ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی، انگریز حکومت کی حکمتِ

عملی اور ایک معروف پنجابی تصنیف "نابر کہانی" (جو جنگِ آزادی اور رائے احمد خاں شہید کے موضوع پر ہے) کے غیر حقیقی بیانیے پر مدلل تنقید کی ہے۔ مصنف نے تاریخی حقائق کی بنیاد پر اصل سچائی کو نمایاں کیا ہے۔ باب کے آخر میں حوالہ جات و حواشی نہایت منظم انداز میں درج کیے گئے ہیں، جو تحقیق کی استناد کو مزید تقویت دیتے ہیں۔ چوتھا باب جنگِ آزادی کے بعد کے سیاسی و سماجی حالات اور تحریکِ پاکستان کی ابتدائی کوششوں پر محیط ہے۔ اس باب میں مصنف نے نہایت عالمانہ انداز میں اس دور کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کو جن سیاسی، معاشی اور فکری ابتریوں کا سامنا کرنا پڑا، ان پر گہرائی سے بحث کی گئی ہے۔ انگریز حکومت کے مظالم، مسلمانوں کی حکمتِ عملی، اور خانقاہ شیخوشریف کے زوال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے خصوصیت کے ساتھ خانقاہِ شیخوشریف کی علمی و روحانی خدمات اور اُس کے سیاسی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد حضرت علامہ محمد اقبال کی عملی میدان میں آمد اور اُن کے افکار کے اثرات کا ذکر نہایت مؤثر پیرائے میں کیا گیا ہے۔ باب کے درمیانی حصے میں خانقاہِ شیخُوشریف اور مسلم لیگ کے باہمی روابط کا ذکر ملتا ہے، مزید برآں، سید محمد حسین گیلانی کی قیادت میں "حزبِ غوثیہ" کے قیام، اور اسی پلیٹ فارم سے م"ماہنامہ الہادی" کے اجراء کا تذکرہ اس باب کی فکری جہت کو نمایاں کرتا ہے۔ ساداتِ گیلانیہ کی تحریکِ پاکستان کے لیے کی گئی بے مثال کوششوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پانچواں باب اس کتاب کا اختتامی اور نہایت جامع و اہم باب ہے، جس میں مصنف نے تحریکِ پاکستان کے فیصلہ کن مراحل کو نہایت تحقیق و بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ باب کا آغاز بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت اور اُن کے خاندانی پس منظر کے تعارف سے ہوتا ہے۔ مصنف نے نہایت دلائل کے ساتھ یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ قائدِ اعظم کے آباء و اجداد بھی ساداتِ گیلانیاں کے دستِ مبارک پر اسلام لائے تھے، اس کے بعد مصنف نے تحریکِ پاکستان کے دوران مسلم لیگ کی جدوجہد کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً علما و مشائخِ عظام کی میدانِ عمل میں آمد کو نہایت اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، پیر سید اصغر علی گیلانی، مخدوم سید ظفر علی شاہ گیلانی (دیپالپوری) مخدوم سید محمد رضا شاہ گیلانی (ملتان) اور سید محمد حسین گیلانی کی دینی، روحانی اور سیاسی خدمات کا تفصیلی تذکرہ اس باب کا علمی و تاریخی حسن قرار دیا جا سکتا ہے۔ باب کے وسطی حصے میں سید محمد حسین گیلانی (بانی ادارہ صوت ہادی) کی غیر معمولی خدمات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ساہیوال اور اس کے گرد و نواح میں مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی بلکہ پورے خطے میں ایک ولولہ انگیز نعرہ بلند کیا "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" یہ

نعرہ تحریکِ پاکستان کے نظریاتی جوش و جذبے کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔ مصنف نے خضر حیات ٹوانہ (وزیرِ اعلیٰ پنجاب) اور سید محمد حسین گیلانی کے مابین سیاسی اختلافات کا ذکر بھی تحقیق و توازن کے ساتھ کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان میں خانقاہِ شیخُوشریف کے عملی کردار، مسلم لیگ کی اعانت، اور قیامِ پاکستان کے اعلان تک کی تاریخی روداد کو نہایت وضاحت اور استناد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔باب کے اختتام پر مسئلۂ مہاجرین، اُن کی آبادکاری، اور خانقاہِ شیخُوشریف کے زیرِ اہتمام اُن کی امداد کے تاریخی واقعات کو درج کیا گیا ہے۔کتاب کے آخر پر سید محمد حسین گیلانی کی وفات کا ذکر ہے اور مصنف نے نہایت عقیدت اور ادبی وقار کے ساتھ اس مردِ مجاہدِ ملت کی آخری ایام اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آخر میں حوالہ جات وحواشی کو سابقہ ابواب کی طرح تحقیقی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سید سَید علی ثانی جیلانی،:''سیرت و سوانح حضرت سید عبدالرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوری''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۱۴ء،ص۱۸۸۔۱۸۹

(۲) ایضاً،ص۱۸۱

(۳) سید سَید علی ثانی جیلانی،:''انیس المظاہر فی سیرت السید عبدالقادر جیلانی ''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۲ء، اشاعت دوم،ص۱۳

(۴) ایضاً،ص۲۵۔۲۶

(۵) سید سَید علی ثانی جیلانی،:''حسب مراتب''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۶ء،ص۴۲

(۶) سید مراتب اختر،:''گنج گفتار''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۱ء،ص۹۶

(۷) ایضاً،ص۱۲۲ (۸) ایضاً،ص۷۸۔۷۹

(۹) سید مراتب اختر،:''جنگل سے پرے سورج''،ادارہ صوت ہادی شیخوشدیف،اوکاڑہ، طبع دوم،۲۰۰۷ء،ص۸۱

(۱۰) ایضاً،۸۳ (۱۱) ایضاً،۹۶ (۱۲) ایضاً،۴۹

(۱۳) سید مراتب اختر،:''گنج گفتار''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۱ء،ص۱۰۳

(۱۴) سید سَید علی ثانی جیلانی،:''حسب مراتب''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۶ء،ص۴۰

(۱۵) ایضاً،ص۶۷

(۱۶) سید مراتب اختر،:''گنج گفتار''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۱ء،ص۸۰

(۱۷) سید مراتب اختر،:''جنگل سے پرے سورج''،ادارہ صوت ہادی شیخوشدیف،اوکاڑہ، طبع دوم،۲۰۰۷ء،ص۹۵

(۱۸) ایضاً،ص۸۶

(۱۹) سید مراتب اختر،:''گنج گفتار''ادارہ صوت ہادی شیخوشریف،اوکاڑہ،۲۰۰۱ء،ص۱۲۷

(۲۰) ایضاً، ص۱۱۴ (۲۱) ایضاً، ص۲۲۱ (۲۲) ایضاً، ص۲۲۰

(۲۳) ایضاً، ص۱۰۱

(۲۴) سید مراتب اختر،:''گزرا بن برسے بادل'' ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۴ء، ص۱۹

(۲۵) سید مراتب اختر،:''گنج گفتار'' ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۱ء، ص۷۰

(۲۶) ایضاً، ص۷۲ (۲۷) ایضاً، ص۱۷۷ (۲۸) ایضاً، ص۶۶

(۲۹) ایضاً، ص۷۳ (۳۰) ایضاً، ص۱۷۶

(۳۱) سید سَید علی ثانی جیلانی:''رائے احمد خاں کھرل شہیدؒ''(تاریخ جنگ آزادی)، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اورکاڑہ، ۲۰۲۰ء، ص۲۰

BIBLOGRAPHY

(1) ayad Sayyed Ali Saani Jilani, *'Seerat-o-Sawaaneh Hazrat Sayyed Abdul Razzaq Gilani Maroof Data Shah Charagh Lahori'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2014, pp. 188-189

(2) ibid, p.181.

(3) Sayyad Sayyed Ali Saani Jilani, *'Anees al-Mazaahir fi Seerat as-Sayyed Abdul Qaadir Jilani'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2022, Isha'at-e-Dovum (2nd Ed.), p. 13.

(4) ibid, pp.25-26

(5) Sayyad Sayyed Ali Saani Jilani, *'Hasb-e-Maraatib'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2006, p. 42.

(6) Sayyed Maratib Akhtar, *'Ganj-e-Guftaar'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2001, p. 96.

(7) ibid, p.122.

(8) ibid, pp.78-79.

(9) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Jungle Se Paray Sooraj'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, Taba'-e-Dovum (2nd Ed.), 2007, p. 81.

(10) ibid, p.83.

(11) ibid, p.96.

(12) ibid, p.49.

(13) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Ganj-e-Guftaar'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2001, p. 103.

(14) Sayyed Sayyed Ali Saani Jilani, *'Hasb-e-Maraatib'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2006, p. 40.

(15) ibid, p67.

(16) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Ganj-e-Guftaar'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2001, p. 80.

(17) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Jungle Se Paray Sooraj'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, Taba'-e-Dovum (2nd Ed.), 2007, p. 95.

(18) ibid, p.86.

(19) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Ganj-e-Guftaar'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2001, p. 127.

(20) ibid, p.114. (21) ibid, p.221.

(22) ibid, p.220. (23) ibid, p.101.

(24) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Guzra Bin Barse Baadal'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2004, p. 19.

(25) Sayyed Maraatib Akhtar, *'Ganj-e-Guftaar'*, Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2001, p. 70.

(26) ibid, p.72. (27) ibid, p.177. (28) ibid, p.66.

(29) ibid, p.73. (30) ibid, p.176.

(31) Sayyad Sayyed Ali Saani Jilani, *'Raey Ahmad Khan Kharral Shaheed (R.A.)'* (Tareekh-e-Jang-e-Azaadi), Idaara Sawt-e-Haadi, Shaikhusharif, Okara, 2020, p. 20.

❖❖❖